حالی شناسی کی جدید جہتیں

(تحقیق تنقید اور تشریح کا منظر نامہ-متفرق عناوین اور مستند حوالوں کا مرقع)

ڈاکٹر سید تقی عابدی

ABSTRACT:

There is no doubt that the ***Mussaddas-e-Madojazar-e-Islam*** is poetry and the ***Hayat e Javid*** are the Hali's "Magnum-opus", but unfortunality his other elegant works were neglected by even the ***Notabesl of Urdu Literature*** Hali was not only a great poet, prose, reformer, a literary giant but he also stood tall among his peers in the line of educational reforms to the forgotten masses and in particular to the women's education.

It was Ghalib's vigionary look and his advise to Hali to continue his poetry writing. It is a fact that Hali got inspiration from both of his mentors Ghalib and Shefta, but in the later life the Punjab Government Book Depot. at Lahore where he was looking the translations of foreign language books into Urdu, made him acquainted and aware of the best western literative, which changed his style and contents of his subject in the future life. The thoughts and message spread in this article provide Hali's transparent sincerity, revolutionary ideas, deep sense of truth and his advise to get adjust with the people for a better life. The elegies of Ghalib and Sir Syed arrated their personalities, their work and deeds. Many Urdu poems throw the Women right of education. Hali was also keenly interested in children education, and his poems on children changed the unwise and toxic perception of the old generation thought process.

مسدس حالی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگارِ غالب اور **حیات جاوید** سے کون واقف نہیں۔ گزشتہ صدی میں شاید ہی کوئی دوسری اُردو منظوم کتاب کے ایڈیشن **مسدس حالی** سے زیادہ شائع ہوئے ہوں۔ **یادگارِ غالب** اور **مقدمہ شعر و شاعری** کا ذکر بالواسطہ یا بلاواسطہ اُردو کی کلاسیک ادبی دستاویز کا اہم جزوِ ضروری سمجھا جاتا ہے اگرچہ وہی تلچھٹ قدیم صراحیوں سے نئے ساغروں میں جمع کر کے پیش کی جاتی ہے جس سے حالی شناسی کے جدید گوشے روشن نہیں ہونے پاتے۔ الطاف حسین حالی ایک ہمہ جہت فنکار تھے جن کی بعض تصانیف معروف اور مشہور ہوئیں لیکن اغلب ادبی کاوشیں طاق نسیاں پر ایک دوبار شائع شدہ کلیات میں دھری رہیں۔ اس خصوصی تحریر میں ہماری کوششیں یہی رہی کہ چمنستانِ حالی کے ان توانا بلند اور گھنے درختوں کو چھوڑ کر جن پر ہمیشہ روشنی رہتی ہے ان گوشوں کو ناظرین کے سامنے پیش کریں جو حالی فہمی میں خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہوئے بھی شرمندۂ تعبیر رہے۔ اس مختصر اور جامع گفتگو میں حالی کے فن اور ان کی فکری اور تعمیری طرز نگارش کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے چناں چہ اس حالی شناسی کے تازہ گلدستہ کو گلشن حالی کے متفرق پھولوں سے سجا کر ان سے منسلک برگ و خار کے ساتھ بازیافت کے گلدان میں رکھا گیا ہے تاکہ اس کے رنگ اور روپ اس خوشبو اور خوش نمائی سے ہر کس و ناکس اپنی وسعت فکری و نظری سے استفادہ کر سکے۔

حالی شناسی کے اس گوشے میں ذیل کے مطالب پر تحقیقی، تنقیدی اور تشریحی گفتگو کی گئی ہے:

☆ حالی کا شاہکار اوّل – مرثیۂ غالب: غالب نے حالی کو حالی اور عالی بنایا۔ حالؔی نے استاد غالب یعنی حسن یوسف کو بازارِ مصر میں پیش کیا۔ غالب کی شخصیت اور فن پر اس سے عمدہ نظم نہیں ملتی۔

☆ حالی سے منسوب فرضی عربی رسالے کی حقیقت کو مستند حوالوں اور منطقی زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔

☆ حالی کے مخالفین کی نقاب کشائی: اگرچہ اس میں کچھ دوست نما دشمن اور کئی پردہ نشین مرد نظر آتے ہیں۔ معتبر اسناد سے پیش کر کے حق گفتاری کا عمل کیا گیا ہے۔

☆ سرسید کا مرثیہ حالی کی زبانی سنیے: وہ کہے اور سنا کرے کوئی۔ سرسید کی محبت عظمت، خدمات اور فتوحات کا مرقع ہے جو بعد میں نثری شکل میں ''حیاتِ جاوید'' بنا۔

☆ کیا حالی کی نثر نگاری سکہ رائج الوقت ہے۔ اکیسویں صدی میں حالی کا طرزِ نگارش ہی ٹکسالی ہے۔ آزاد، شبلی، نذیر احمد اور سرسید کا طرز اور اسلوب اب کتابوں کی زینت ہے۔

☆ حالی کی پہلی تصنیف ''مولود شریف'' کا اجمالی تذکرہ: اس لیے ضروری ہے کہ اس سے حالی کی نعتیہ قدروں اور عشق نبویؐ کا احساس ہوتا ہے۔

☆ حالی کی نظموں کا سماجی، تعمیری، تعلیمی، تاثیری اور تنقیدی منظرنامہ: حالی اُردو نظم کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اُردو نظم میں فکری انقلاب بپا کیا۔

☆ میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند: حالی کی جھڑپ شیخ واعظ اور مفتی کے ساتھ۔ شاید ہی کوئی اُردو کا دوسرا

شاعر ہو جس نے اتنی کثرت، اتنی شدت اور اتنی زیادہ تعداد میں مختلف پیرایوں میں اشعار کیے ہوں۔

☆ اقبال، حالی کی شخصیت اور تعمیری فکر کے عاشق تھے: اقبال، حالی کی انقلابی فکر کے ڈکشن کی توسیع ہیں۔ کچھ لمحات جیسے تاریخ نے محفوظ کر لیے، پیش کیے گئے ہیں۔

☆ نسل جوان اور بچوں کی تعلیمی و تربیت میں حالی کا حصہ: اقبال کی طرح حالی بھی نسل جوان سے متوقع ہیں کہ نئی تعلیم و تربیت سے تسخیر نفس امارہ اور دنیائے رنگ و بو میں رہیں گے۔

☆ حالی کے خواب جو پورے نہ ہو سکے: حالی کے عزم اور استقلال کا پتا چلتا ہے جو حالی فہمی کے لیے ضروری ہے۔

حالی کا شاہکارِ اوّل – مرثیۂ غالبؔ:

حالی اردو شخصی مرثیے کے مجدد تھے۔ اگرچہ عربی میں کربلائی مراثی سے پہلے اور بعد میں شخصی مرثیوں کا رواج تھا لیکن اُردو شاعری میں یہ کمی قطعہ تاریخ وفات سے منسلکہ چند شعروں میں پوری کی جاتی تھی۔ چناں چہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں بعض نظمیں مرنے والے کے غم اور اس کے اخلاق حسنہ اور اعمال عمدہ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں لیکن اس صنف نے غدر کے بعد شعرا کے ایک بڑے گروہ کو اپنا طرف دار کر لیا جس کی وجہ سے ایک بڑا ذخیرہ شخصی مراثی کا اُردو شاعری میں جمع ہو گیا۔ غالب نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین عارف اور اپنی معشوقہ کے مرنے پر مرثیے لکھے۔ دونوں مرثیے غزل کی شکل میں ہیں جن میں درد و غم اور رنج و محن سے لبریز جذبات اور احساسات ہیں۔ مومن نے اپنی معشوقہ کی وفات پر بارہ اشعار پر مشتمل مرثیہ لکھا جو ترکیب بند میں شمار ہوتا ہے۔ حالی نے دس سے زیادہ قطعات تاریخ وفات اور نو سے زیادہ شخصی مرثیے لکھے جس میں ایک مرثیہ فارسی میں سر سید پر بھی نظر آتا ہے۔ حالی نے شخصی مرثیے لکھنے کی تاکید بھی کی جس کے نتیجہ میں درجنوں شخصی مرثیے تخلیق ہوئے۔

حالی نے مرثیوں اور تاریخ وفات کے قطعوں میں مبالغہ اور جھوٹی مدح کے بغیر سیدھے سادے اشعار میں مرحوم یا ممدوح کی صفتیں خوبیاں اور ہنرمندی کے کرشموں کو نظم کیا ہے جو ایک منظوم ریویو ہو سکتا ہے۔

محمد حسین آزادی متوفی ۹ رمحرم ۱۳۲۸ ہجری مطابق ۲۲ رجنوری ۱۹۱۰ء کی تاریخ وفات کا قطعہ ہمارے بیان کا ثبوت ہے۔ ان آٹھ اشعار میں حقیقت سلیس الفاظ میں پیش کی گئی ہے۔ آزاد کا فن، شخصیت، سفر زندگی اور مرنے کی تاریخ سب کچھ اس قطعے میں موجود ہے:

آزاد وہ دریائے سخن کا دُرِ یکتا | جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ | جو اُس کے قلم سے دمِ تحریر ہے ٹپکا
ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر | چھوڑا نہ دقیقہ کوئی رنج اور تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں | تصنیف کا ، تدوین کا ، تحقیق کا لپکا
صحت میں، علالت میں، اقامت میں، سفر میں | ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے ، مشتاق | بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا

آخر شب ، عاشور کو تھی جس کی تمنا آ پہنچا نصیبوں سے بلاوا اُسے رب کا
تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی کہہ دو کہ ''ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا'' (۱)

الطاف حسین حالی کا ایک زندہ شاہکار غالب کی موت پر شخصی مرثیہ ہے۔ غالب کی موت پر نثری تحریروں کے علاوہ منظور گلدستۂ خراج عقیدت رباعی قطعات ترکیب بند اور ترجیع بند میں نظر آتے ہیں۔ غالب کا انتقال فروری ۱۸۷۹ء کو دہلی میں ہوا۔ غالب کی وفات کے قطعات ان کی وفات کے فوری بعد ''اکمل الاخبار'' میں شایع ہوتے رہے اور ہر شمارے میں ایک سے زیادہ قطعات شایع ہوئے۔ مدیر ''اکمل الاخبار'' نے جولائی ۱۸۷۹ء میں میر مہدی مجروح کے ترجیح بند کو شایع کر کے اس سلسلے کو ختم کیا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ غالب کے انتقال کے زیادہ سے زیادہ چار مہینے بعد مجروح نے دس بند کا مرثیہ لکھا جس کا ہر بند اس شعر پر ختم ہوتا ہے:

رشک عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد اسد اللہ خان غالب مرد

یہ شعر مجروح کے مرثیے میں ترجیح بند ہونے کی وجہ سے دس بار دہرایا گیا۔ اس ترجیح بند شعر کو قربان علی بیگ سالک کے ترجیع بند مرثیے کے چھے بندوں میں دہرایا گیا اور حالی نے اپنے ترکیب بند میں بھی اس شعر کو ایک بار استعمال کیا۔ ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان تینوں شاعروں میں کس نے سب سے پہلے غالب کا مرثیہ لکھا لیکن غالب کے خطوں سے یہ ظاہر ہے کہ خود غالب نے ۱۲۷۷ ہجری میں اپنی تاریخ وفات ''غالب مرد'' نکالی تھی (۲) جب مذکور تاریخ گزر گئی تو ان کے چہیتے شاگرد مجروح نے لکھا کہ:

''مذکور' تاریخ سلامتی سے گزر گئی اب حضور کیا فرماتے ہیں۔''

غالب نے ۱۷ محرم ۱۲۷۸ کے خط میں لکھا:

''لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔''

اگر چہ مرزا غالب کی وفات پر مختلف شاعروں نے اشعار لکھے، تاریخ وفات نکالی لیکن یہاں ہم غالب کے دو اہم شاگردوں کے ترجیع بند کا حالی کے ترکیب بند پر مفصل گفتگو کرنے سے پہلے اس لیے بھی ''ذکر کریں گے کہ یہ مراثی ایک ہی بحر میں ہیں۔ ان کا تاریخی شعر بھی ایک ہی ہے لیکن رنگ اور مطالب جدا جدا ہیں۔ مجروح کا مرثیہ جو دس بند اور ہر بند میں آٹھ مختلف اور ایک یکساں شعر یعنی (۸۱) اشعار پر مشتمل ہے۔ مجروح نے غالب کی شخصیت اور ان کے فن سے آغاز کیا:

کیوں نہ ویران ہو دیارِ سخن مر گیا آج تاجدارِ سخن
بلبل خوش ترانہ معنی گل رنگیں شاخسارِ سخن

عرصہ نظم کیوں نہ ہو ویراں ہے عنان کش وہ شہسوارِ سخن
کیوں نہ حرفوں کا ہو لباس سیاہ ہے غمِ مرگ شہر یار سخن
ساتھ ان کے گئی سخن سنجی ان کا مرقع ہی ہے مزارِ سخن
آبیاری تھی جس سے وہ نہ رہا اب خزااں ہو گئی بہارِ سخن
نغمۂ پیرائیاں کہاں ویسی اب یہ ہے نالہ ہائے زارِ سخن
رشک عرفی و فخر طالب مرد اسد اللہ خان غالب مرد (۳)

غالب کے اس مرثیے میں مجروحؔ نے جو اشعار اپنے دیوان میں شامل کیے ہیں وہ اکمل الاخبار کے ترجیع بند سے ذرا مختلف ہیں اور یہاں ان کی تعداد بھی زیادہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجروح نے کچھ ترمیم کے ساتھ اشعار میں اضافہ بھی کیا۔ تمہیدی یا تشبیب کے بند میں غالب کو تاجدارِ سخن، شہسوارِ سخن، بہارِ سخن اور شہر یارِ سخن کہہ کر غالب کی موت سے جو ویرانی تباہی اور خزاں سخن پر چھائی اس کا ذکر کیا ہے۔ یہاں فن کے لحاظ سے ان کی خوش ترانہ معنی، سخن سنجی اور نغمہ پیرائی کے ساتھ عرفی شیرازی اور طالب آملی کے رشک کے ساتھ غالب کی موت کا ذکر ہے۔ مجروح نے غالب کے مزاج کی تہذیب و شرافت، ان کا صلح جو برتاؤ ان کی گفتگو کی اثر اندازی اور بات سے بات بنانے کے ہنر کو خوبصورتی سے اشعار میں ڈھالا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ غالب کی ان شخصی باتوں سے مہدی مجروح سے زیادہ کون واقف ہوگا وہ غالب کے سب سے چہیتے شاگرد تھے جو غالب کے خطوں سے ظاہر ہے۔

مجروح لکھتے ہیں:

تھی جو ان کے مزاج میں تہذیب وہ جہاں میں نہیں کسی کو نصیب
صلح کل کا رکھا تھا جو برتاؤ تھے وہ دشمن کی بھی نظر میں حبیب
گفتگو میں بڑی وضاحت تھی ہوتے تھے محو جس کو سن کے ادیب
تھا ہر اک بات کا نیا انداز ہر سخن کی تھی ایک نئی ترکیب

مجروحؔ کا یہ کہنا کہ ہر بات کہنے کا ڈھنگ نرالا تھا یعنی ’’ہر سخن کی تھی ایک نئی ترکیب‘‘ غالب شناسی کا اہم نکتہ ہے کیوں کہ:

کہتے ہیں کہ غالب کا تھا اندازِ بیاں اور

مجروح کے مرثیے میں جو غالب کی موت کا درد و الم اور رنج و غم کا منظر نظر آتا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب کے شاگردوں میں کوئی بھی اتنا غالب سے مانوس اور قریب نہ تھا:

ان کی شفقت جو یاد آتی ہے چشم دریائے خوں بہاتی ہے
ان کی دوری میں ہے یہ بدمزگی کہ نہیں زیست اپنی بھاتی ہے
یہ انھیں کا مزار ہے شاید یاں سے کچھ بوئے الفت آتی ہے
ہائے جنگل میں اس کی قبر بنی کاخ معنی کی جو کہ تھا بنیاد

مقطع کے بند میں کہتے ہیں:

گرد تابوت تھا ہجوم کبیر اہل ماتم میں تھی یہی گفتار
جو کہ جاتے تھے ہمرہِ تابوت یہی کہتے تھے وہ پکار پکار
رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد اسد اللہ خان غالب مرد

اس تحریر میں آگے چل کر ہم یہ بتائیں گے کہ حالی اور مجروح کے مرثیوں میں متن کے لحاظ سے اور اندازِ بیان کی رو سے بڑا فرق ہے کیوں کہ دونوں بڑے فطری شاعر ہیں اگرچہ دونوں غالب کے شاگرد ہیں جن کو ایک ماحول ملا اور دونوں کا مبدا ماویٰ ملجا اور محسن ایک تھا جس نے دونوں پر عنایت شفقت اور محبت کی تھی۔

غالب کے ایک اور ممتاز شاگرد اور عمدہ شاعر قربان علی سالک نے بھی ترجیع بند میں چھ بند کا مرثیہ اسی بحر میں لکھا اور ہر بند میں:

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد اسد اللہ خان غالب مرد

کے ٹیپ کے شعر کو دہرایا۔ سالک نے حالی کی طرح ایک علیحدہ ۱۹/اشعار کا قطعہ تاریخ بھی لکھا جس کی ادب میں ان کے مرثیے سے زیادہ پذیرائی ہوئی کیوں کہ یہ مطلب ہماری گفتگو کا مقصد نہیں اس لیے ہم یہاں صرف ترجیع بند مرثیے پر اکتفا کرتے ہیں جس میں غالب کی شخصیت اور سالک سے ان کی نسبت ایک غم آلودہ فضا میں دکھائی گئی ہے:

خضرِ راہِ سخن جہاں سے گیا ہادیِ راہ کارواں سے گیا
اب کہاں گل فشانیِ مضمون خامہ حسرت فگار سونا تھا
تھا سکوں میں جو مرکزِ خالی نہیں اس دل کو مثل برق قرار
سطحۂ خاک کی الٰہی خبر آج رکھتے نہیں ہیں دیدۂ تر
غم استاد ہے اگر یہ بھی یا خدا کیوں کہ زندگی ہو گی
کیا کہوں کون مر گیا سالکؔ آپ کہتے ہیں طالب و عرفی
رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد اسد اللہ خان غالب مرد

حالی کے ترکیب بند مرثیے پر بات کرنے سے پہلے ہم ان کے آٹھ شعر کے قطعہ تاریخ وفات غالب پر یہ کہیں گے کہ اس قطعہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ سال تاریخ ۱۲۸۵ء کا شعر خود غالب کے مصرع ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' سے صنعت تخرجیہ کی مدد سے نکالی گئی ہے۔ یعنی پہلے مصرعے میں ''تاریخ'' ہم نکال چکے پڑھ بغیر ''فکر'' = ۱۲۱۱ (تاریخ) + (۳۰۰) فکر = ۱۵۱۱

۲۷۹۶

''حق مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا'' ۱۲۸۵ = ۱۵۱۱ - ۲۷۹۶ھ

غالب کے مصرعہ کے اعداد سے اگر ''تاریخ'' اور ''بغیر فکر'' کے اعداد نکال دیے جائیں تو غالب کی تاریخ وفات کے عدد نکلتے ہیں۔ اردو شاعری میں حالی کا یہ عمل جدید تھا جس کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ اس کی تقلید کی گئی اور ہم

دیکھتے ہیں کہ میرانیس، مرزا دبیر، اقبال، جوش اور جگر جیسے شاعروں کی تاریخ وفات بھی ان کے مصرعوں سے نکالی گئی:

جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں (انیسؔ)
تحصیل سعادت کو دبیر آیا ہے (دبیرؔ)
میں شاعر آخرلزماں ہوں اے جوش (جوشؔ)

حالی نے اس قطع میں غالب کے پرستاروں غالب کے دلی اور سب سے اہم خود اپنی کیفیت بیان کی ہے جہاں تک غالب کی شخصیت اور ان کے فن کا تعلق ہے اس کا پرتوی اور ان کے مقام کا تعین بھی اس مختصر قطعے میں نظر آتا ہے۔ غالب کے موت کی خبر سن کر جو دلی کا حال ہوا:

غالب نے جب کہ روضۂ رضواں کی راہ لی ہر لب پہ آہ سرد تھی ہر دل میں درد تھا
اس دن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہ پوچھ دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا

حالی غالب کے مقام کو تقابلی انداز میں پیش کرتے ہیں:

تھا گو وہ اک سخنور ہندوستاں نژاد عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا
اس قافلے میں آ کے ملا گو وہ سب کے بعد اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا

حالی کے حال کی تصویر دیکھیے:

حالی کہ جس کو دعویٰ و ضبط ہے دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا
ہم اور صبح و شام یہ اندوہ جانگزا دل تھا کہ فکر سال میں بے صرفہ گرد تھا

حالی غالب کے شاگرد ہیں۔ ہر شاعری کی منزل پر غالب سے رہنمائی کے طلب گار ہیں۔ یہ استاد غالب ہی کا فیض تھا کہ انھیں ایک جاویدانہ مصرعہ ملا جس میں غیرفانی تاریخ نکلی جو غالب کی تاریخ وفات پر نکالی گئیں تمام تاریخوں میں عمدہ اور شاہکار ہے:

ناگاہ دی یہ غالب مرحوم نے صدا سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا
''تاریخ'' ہم نکال چکے پڑھ ''بغیر فکر'' ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''

حالی کا ترکیب بند مرثیہ غالب کے انتقال ۱۸۶۹ء کی تخلیق ہے۔ اس مرثیے میں دس بند ہیں اور ہر بند میں دس شعر۔ ہر بند کے ٹیپ کا شعر جدا ہے اور تمہیدی بند کے بعد کے دوسرے بند کا آخری شعر وہی ہے جو مجروح سالک اور دوسرے شعرا نے نظم کیا ہے جس کا ماخوذ خود غالب کا فقرہ ''غالب مرد'' ہے:

رشک عرفیؔ و فخر طالبؔ مرد اسد اللہ خاں غالبؔ مرد

بعض افراد نے اس شعر کی اوّلیت کا سہرا حالی کے سر بندھا ہے لیکن کوئی معتبر حوالہ ایسا نہیں پیش کیا جس میں یہ دکھایا جائے کہ حالی نے یہ مرثیہ مجروحؔ سے پہلے یعنی جون ۱۸۶۹ء سے قبل کہا ہو۔ البتہ مرثیے کے اس شعر کی اوّلیت اور تقدم سے اس بات پر کچھ اثر نہیں پڑتا کہ یہ مرثیہ غالب پر کہے گئے تمام مراثی اور قصاید سے بہت بلند و برتر ہے۔ مرثیہ کیا ہے غالب کی شخصیت، حیات، منزلت، قابلیت اور فن کا مرقع ہے۔ اس مرثیے کے سوا اشعار میں

جن مطالب کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کی تشریح، تجزیہ اور تحلیل کے لیے پورے رسالے کی ضرورت ہے۔ حالی کے اس مرثیے نے برصغیر کی افسردہ پژمردہ سوسائٹی میں غالب کے نام و مقام زمانے کے پرآشوب ماحول میں مٹ جانے سے بتایا۔ چناں چہ غالب کا کلام ہمیشہ عوام اور خواص میں مقبول رہا اور مسلسل شایع ہوتا رہا اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی جس کو پورا کرنے کے لیے بیس (۲۰) سال بعد حالی نے غالب کی سیرت اور فن کی شناخت کا تاج محل **یادگارِ غالب** تیار کیا جو آج تقریباً سوا سو سال کے گزرنے کے باوجود معتبر اور معروف صحیفہ مانا جاتا ہے۔ یہاں اس مرثیے کے تجزیے اور تشریح سے پہلے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ جس وقت یہ مرثیہ تصنیف ہوا اُس وقت حالی کی عمر (۳۲) سال تھی۔ حالی کی کچھ شیفتہ اور دوسرے اربابِ شعر و ادب دہلی کے مصاحب ضرور تھے اور سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ غالب کو اپنا کچھ کلام دکھا کر وہ فطری شاعر ہونے کی سند بھی لے چکے تھے۔ غالب نے کہا تھا:

تمھارے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔(۵)

سچ تو یہ ہے کہ غالب کے اس جملے نے حالی کی شعری زندگی بنا دی جس طرح غالب کی آئین اکبری کی تقریظی مثنوی نے سرسید کو ان کی داخلی قوتوں سے آشنا کروایا یا دوسرے الفاظ میں سید احمد خان کو سرسید بنایا۔ حالی غالب سے چالیس سال چھوٹے تھے لیکن جوانی ہی سے جرأت اور اپنی فکر کے اظہار میں تامل نہیں کرتے تھے۔ چناں چہ حالی نے جو خط قطعہ وغیرہ لکھا اور غالب نے اس کا جواب دیا اس بات کی دلیل ہے کہ غالب اور حالی کو ایک دوسرے کا لحاظ اور احساس تھا۔ شاید غالب اپنے آیندہ نشو و نما پانے والے باغ کو دیکھ رہے تھے جہاں ان کا عندلیب چہچہائے گا۔ اسی لیے غالبؔ نے جو قطعہ لکھا اس میں حالی ہی کو محورِ سخن بنایا:

چوں حالی از منِ آشفتہ بے سبب رنجید　　تو گر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بہ فرضِ محال　　برآں سرم کہ در آں عمر ایں دو کار کنم
یکی ادائے عباداتِ عمرِ پشینہ　　دگر بہ پیشِ گہہ حالی اعتذار کنم

اگرچہ حالی اور غالب کے تعلقات گیارہ بارہ سال سے زیادہ نہ تھے وہ بھی کبھی ملاقات کی صورت میں اور کبھی خط و کتابت کے ذریعے لیکن حالی غالب کی زندگی کے تمام تر واقعات اور حالات سے واقف تھے کیوں کہ غالب کی فطرت میں عیب و ہنر سب کچھ لوگوں کے سامنے ہوتے یعنی وہ ایک عمدہ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کھلی کتاب کے مانند تھا جسے ہر شخص پڑھ سکتا تھا۔ حالی نے اس کتاب زندگی کے ورق ورق کا مطالعہ کیا تھا تب ہی تو مرثیہ کے ایک شعر میں سوا اشعار کا خلاصہ کر دیا۔

مظہر شان حسن فطرت تھا　　معنی لفظ آدمیت تھا

حالی نے مرثیہ غالب کے علاوہ ایک قطعہ تاریخ وفات بھی لکھا جس کی تاریخ غالب ہی کے مصرعے ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' سے نکالی۔ حالی کے اجتہادی تخلیقی رویے کی تقلید کی گئی اور کئی مصرعے تاریخی وفات انھی شاعروں کے مصرعوں سے نکالے گئے۔ میر انیس نے شہدائے کربلاؑ کے مرثیوں کی آئین بندی کرتے ہوئے کہا تھا:

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

یہی آئین شخصی مرثیوں پر بھی عاید ہوتا ہے اس میں درد کا ہونا ضروری ہے۔ خود غالب نے مرثیہ عارف، مومن نے محبوبہ کا مرثیہ وغیرہ کے علاوہ کئی قطعات تاریخ وفات مختلف شعرا کے ملتے ہیں وہ جو درد والم کے مضامین سے بھرے نظر آتے ہیں۔

ہم نے حالی کے اس مرثیے کو اس کے متن اور مضمون کے لحاظ سے تقسیم کر کے اشعار کو بندوں سے گل چین کیا ہے تا کہ بکھرے ہوئے پھولوں کو جن کا رنگ تقریباً ایک جیسا ہے گلدستہ بنا کر پیش کر سکیں۔

حالی نے اگر چہ انیس کے مرثیوں کا بغایت مطالعہ کیا تھا اور صنف مسدس میں آگے بڑھ کر انھوں نے مد و جزر اسلام لکھا۔ شخصی مرثیوں میں حکیم محمد خان دہلوی کا مرثیہ بھی مسدس میں تصنیف کیا لیکن یہاں ترکیب بند کا انتخاب، چھوٹی بحر میں اظہار اور مضامین کا بکھراؤ وغیرہ اس بات کا سراغ دیتے ہیں کہ وہ اس مرثیہ کا جاودانہ شعر:

رشک عرفیؔ و فخر طالبؔ مرد اسد اللہ خان غالب مرد

کو پیوند کرنا چاہتے ہوں۔ (اللہ ھوالعالم)

مرثیہ کی تمہید مرثیے کے مضمون کے اعتبار سے عمدہ ہے جو دنیا کی بے ثباتی چرخ کی بے رحمی، فلک کی جفاکشی کے ساتھ سوائے اللہ ہر چیز فانی، بے اعتبار ہے یعنی لاموجود الا اللہ کی تفسیر بھی ہوسکتی ہے۔

حالی مطلع کے شعر میں صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ اس نظم میں اپنا درد بیان نہیں کر سکتا کیوں کہ

وقت کوتاہ قصہ طولانی

مرثیہ کا آخری شعر جو عربی شعر ہے۔ اس کے معنی ہیں:

ہم اس کے غم میں کتنا روتے اور آہ و زاری کرتے ہیں اور کتنی مدت سے زمانے کو ملامت کر رہے ہیں۔ (۲)

کم العافیہ من بکے وعویل وعتاب مع الزمان طویل

حالی نے تمہید مرثیے کے پہلے دو بندوں میں باندھی ہے۔ شاعر کہتا ہے دنیا فانی ہے ہر چیز یہاں کی وہم اور گماں کی کہانی ہے۔ تمام عیش وعشرت نام ونمود حقیقت نہیں بلکہ طلسم زندگانی ہے۔ شاعر کا ان چیزوں سے دل سیر ہو چکا ہے۔

حالی یہاں تلمیحات اور اصطلاحات سے مصرعوں کے کوزوں میں سمندر بھر دیتے ہیں۔ تاج فغفور چین کے بادشاہ کا تاج، تخت خاقانی ترکستان کے بادشاہ کا تخت، جمشید کا جام جس پیالے میں وہ ملک کے تمام حالات دیکھ سکتا تھا، راحِ ریحانی وہ خوشبو بھری شراب، عقل یونانی یعنی افلاطون ارسطو وغیرہ کی عقل مندیاں، حضرت داوٗدؑ کا وہ لحن جس کو سُن کر پرندے تک مست ہو جاتے تھے۔ حسن کنعانی حضرت یوسفؑ کا حسن، چشمہ خضر جس سے حضرت خضرؑ نے آبِ حیات پیا ہے، خاتم سلیمانی یعنی حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی جس پر کہتے ہیں اسم اعظم لکھا ہوا تھا اور اس کے باعث تمام مخلوقات آپؑ کی مطیع تھیں۔ یہ تمام چیزیں فریب بے حقیقت غلط اور دھوکا ہے۔ میں ان تمام کی پروا

نہیں کرتا:

ہے سراسر فریب و ہم و گماں　　تاج فغفور و تخت خاقانی
بے حقیقت ہے شکل موج سراب　　جام جمشید و راحِ ریحانی
لفظ مہمل ہے نطق عرابی　　حرف باطل ہے عقل یونانی
ایک دھوکا ہے لحن داؤدی　　اک تماشا ہے حسن کنعانی
بحر ہستی بجز سراب نہیں　　چشمہ زندگی میں آب نہیں

اس لیے شاعر کہتا ہے:

نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک　　چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے　　گر ملے خاتم سلیمانی

اس لیے بہتر یہ ہے کہ عمر بے وفا پر بھروسہ نہ کیا جائے اور زمان و مکان سے دل کو جوڑا نہیں بلکہ توڑا جائے:

تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر　　تونے کی جس سے بے وفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ　　ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
جس سے دنیا نے آشنائی کی　　اس نے آخر کو کج ادائی کی

حالی نے مصرعوں میں صنعت تضاد سے معنی آفرینی پیدا کی ہے۔ آشنائی، بیگانہ، وفا، بے وفا، صلح اور لڑائی وغیرہ۔

صلح میں چاشنی لڑائی کی

پھر گریز کر کے اس درد اور بے وفائی کو غالب کی موت سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس گریز کی خوبصورتی اور حاصل بند شعر کا کمال یہ ہے کہ غالب کا تقابلی اور مقام چار فارسی کے عظیم شاعروں یعنی خاقانی، سنائی، عرفی اور طالب آملی سے اس طرح سے ہوتا ہے کہ وہ اس گلدستہ کے گل سر سبد نظر آتے ہیں:

بات بگڑی رہی سہی افسوس　　آج خاقانی و سنائی کی
رشک عرفیؔ و فخر طالبؔ مرد　　اسد اللہ خان غالبؔ مرد

دوسرے بند کا ٹیپ کا شعر فارسی میں ہے لیکن اُردو میں عام فہم ہے۔

حالی نے غالب کی نظم و نثر سے ایسے نکات چنے ہیں جن کو اگر عنوان بنا کر ان کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ حالی نے غالب کو صرف دیکھا اور سنا ہی نہ تھا بلکہ پڑھا اور بڑی حد تک سمجھا بھی تھا۔ جہاں تک غالب کے شاگردوں کا تعلق ہے کوئی بھی حالی کی غالب شناسی اور غالب فہمی تک نہیں پہنچا۔ حالی نے غالب کے کلام کے قطروں میں دجلہ دیکھا اور دکھایا۔ ممکن ہے دوسرے اربابِ فکر و فراست نے بھی ان چیزوں کا بغور مشاہدہ کیا ہو لیکن کیوں کہ انھوں نے اس بصیرت کو فضا میں بکھیرنے کے بجائے قبر کی تاریکی میں سینوں میں بند رکھا ہم ان پر کیا کہہ سکیں گے۔ کچھ اشعار اور مصرعوں کو جوڑ کر ہم غالب کے فن کے کمال پر حالی کی فکر کی روشنی دکھاتے ہیں:

بلبل ہند مر گیا ہیہات　　جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس

نثر حسن و جمال کی صورت — نظم غنج و دلال کی صورت
قال اس کا وہ آئینہ جس میں — نظر آتی تھی حال کی صورت
اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی — شکل امکاں محال کی صورت
اس کی تاویل سے بدلتی تھی — رنگ ہجراں وصال کی صورت
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا — قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

حالی نے اس مرثیے میں غالب کا ذکر فارسی کے دس بارہ شاعروں سے کیا ہے۔ حالی جانتے تھے کہ غالب نے اپنے ایک قطعہ میں خود کو بھی ان شاعروں کی محفل کا شاعر کہا تھا:

ای کہ راندی سخن از نکتہ سریان عجم — چہ بما منت بسیار نہی از کم شان
ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود — یاد در خلوت شان مشک فشان از دمشان
مومن و نیر و صہبائی ، علوی وانگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جان گرچہ نیرزد بشمار — ہست در بزم سخن ہم نفس و ہم دم شان

یعنی اے کہ تو نے ایرانی شعرا کی بات کر کے ہم پر ان چند شعرا کے احسان دھرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان میں ایسے خوش گو شاعر موجود ہیں جن کی معطر سانس سے ہوا ان کی خلوت کو مشک کی خوشبو کر دیتی ہے۔ اُن میں مومن خان مومن، ضیاء الدین احمد خان نیر، امام بخش صہبائی، عبداللہ خان علوی، مصطفیٰ خان حسرتی، اشرف اور مفتی صدر الدین آزردہ جیسے عظیم شعرا موجود ہیں۔ اگرچہ غالب بدنصیب کسی شمارے کے قابل نہیں لیکن پھر بھی بزم سخن میں ان عظیم شعرا کا ہمدم اور ہم نفس ہے۔(۷)

غالب نے متعدد مقامات پر اپنے فارسی کلام میں کہیں عجز و انکساری کے ساتھ اور کہیں تعلّی کے ساتھ اپنا تعارف کروایا۔

بیادرید گر اینجا بود زبان دانی — غریب شہر سخن ہای گفتنی دارد

''اگر کوئی زبان کا ماہر ہے تو لائیں میں جو اس شہر کی زبان کا بیگانہ ہوں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

زلہ بردار کس چرا باشم — من ہمائم مگس چرا باشم

''کسی کے دسترخوان کے ٹکڑے کھانے والا کیوں رہوں میں ہما ہوں مجھے مکھی بننے کی ضرورت کیا ہے۔''

تو ای کہ محو سخن گستران پیشینی — مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

''تو جو گزرے برے شاعروں کا ذکر کر رہا ہے۔ غالب کا منکر نہ ہو جو تیرے دور میں موجود ہے۔''

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب — جام دگران بادۂ شیراز نہ دارد

’’چاہتے ہو عرفی کی شعریت کا مزا چکھو تو غالب کا جام لو دوسرے ساغروں میں شیرازی شراب نہیں۔‘‘

منج شوکتِ عرفی کہ بود شیرازی — مشو اسیر زلالی کہ بود خوانساری

بہ سومناتِ خیالم در آی تا بینی — روان فروز برو دوشھای زنّاری

’’تم شوکت عرفی کے شیرازی اور اسیر کے خوانساری یعنی ایرانی ہونے کی وجہ سے مرعوب نہ ہو بلکہ تم میرے سومناتی خیالات کی دنیا میں آ کر تو دیکھو جہاں میرے روحانی تجلّی میرے کاندھوں سے بکھر رہی ہے اگرچہ میرے سینے پر زنار پڑا ہوا ہے۔‘‘ (۸)

حالی نے مرثیہ میں غالب کے مقام کا تعین کیا ہے۔ آج تک کسی نے ایسا ہنرمندانہ تنقیدی کام نہیں کیا۔ کوئی فارسی غیر ملکی یہ کام نہیں کر سکتا۔ عربی محاورہ ہے کہ سب سے اچھی ہماری انگلی ہی ہوتی ہے جو اپنی پیٹھ کھجا سکتی ہے۔ حالی کے کچھ شعر دیکھیں:

اہل ہند اب کریں گے کس پر ناز — رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا

چشم دوراں سے آج چھپتی ہے — انوری و کمال کی صورت

بات بگڑی رہی سہی افسوس — آج خاقانی و سنائی کی

رشک عرفی و فخر طالب مرد — اسد اللہ خاں غالب مرد

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہل انصاف غور فرمائیں

قدّسی و صائبؔ و اسیرؔ و کلیم — لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت — خاک کو آسماں سے کیا نسبت

ناظم ہروی نے فارسی کے عظیم شاعروں کو اپنی مثنوی میں نظم کیا تھا جس میں عنصری سے جامی تک کا ذکر تھا اس مثنوی کے اشعار میں غالب نے آخری شعر کا اضافہ کر کے فارسی کلاسیکی شاعری پر مہر لگا دی۔ ناظم ہروی کہتے ہیں:

شنیدم کہ در دور گاہ کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن

چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسہ آمد کُلاہِ نہی

چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساط سخن

نظامی چو جام اجل در کشید — سر چتر دانش بہ سعدی رسید

چون اورنگ سعدی فروشد ز کار — سخن گشت بر فرق خسرو نثار

ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

اس مثنوی میں غالب نے اضافہ کیا:

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید ز عرفی و طالب بہ غالب رسید (۸)

غالب کے مرنے سے جو اقلیم سخن کو نقصان پہنچا اس کا ذکر بڑی خوبی کے ساتھ حالی نے کیا حالی جانتے تھے غالب کی مسند خالی رہے گی:

نقد معنی کا گنج داں نہ رہا خوان مضموں کا میزباں نہ رہا
رونق حسن تھا بیاں اس کا گرم بازار گل رخساں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن
شاعری کا کیا حق اس نے ادا پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا
لوح امکاں سے آج مٹتی ہے علم و فضل و کمال کی صورت
ہند میں نام پائے گا اب کون سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ملک یک سر ہوا ہے بے آئین اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
حصر تھی اک بیاں میں رنگینی کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں

جہاں تک اخلاق، انسان دوستی، احترام، عجز و انکساری اور بھائی چارگی تھی غالب ایک فرشتہ صفت آدمی تھے۔ حالی نے یہ اخلاق کچھ اپنی فطرت کچھ اپنے استاد غالب سے سیکھے تھے:

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج رند اور مرجع کرام و ثقات
پاک دل پاک ذات پاک صفات
بے ریائی تھی زہد کے بدلے زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
مظہر شان حسن فطرت تھا معنی لفظ آدمیت تھا

حالی نے مرزا غالب کی شخصیت اور فطرت کو ''معنی لفظ آدمیت'' کہہ کر قلم توڑ دیا۔ غالبؔ دہلوی تھے۔ حالی دلی کے عاق تھے۔ دلی غالب کی تھی اور غالب دلی کے لیے تھے۔ حالی نے غالب کے بغیر دلی کو ویرانہ بنا کر جو پیش کیا ہے وہ سچ ہے:

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
شہر سارا بنا ہے بیت حزن ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے جا کے دلی سے آئے گا اب کون
غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد کس سے خالی ہوا جہاں آباد
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا — شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ آغا حیدرحسن نے حالی کے مصرعہ میں تضمین کر کے ''مرزا نوشہ تھا اور دلی برات'' ۱۸۷۹ء تاریخ وفات نکالی ہے۔

حالی کے اس مرثیے میں ایسے بھی مصرع موجود ہیں جن سے جلوس جنازہ اور تدفین کی منظرکشی کا سماں پیدا ہوتا ہے۔

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے — اس کو دل سے بھلائے گا اب کون
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے — غالب بے مثال کی صورت
بار احباب جو اٹھاتا تھا — دوش احباب پر سوار ہے آج
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر — ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو — سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

مرثیے میں حالی نے شاگردی کا فیض استاد غالب کی اصلاح شاعری کے وہ رموز جس نے خالی ذہنوں کو عالی کر دیا بیان کیا ہے۔ ان شعروں میں جذبات کی شدت ہے جیسے وہی شخص پوری طرح سے درک کر سکتا ہے جس پر یہ سانحہ گزرا ہے:

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل — کس سے داد سخن وری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب — کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضموں ہے نوحۂ استاد — کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
مر گیا تشنۂ مذاق کلام — ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون
مر گیا قدر دانِ فہم سخن — شعر ہم کو سنائے گا اب کون
تھا بساط سخن میں شاطر ایک — ہم کو چالیں بتائے گا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالی — غزل اس کی بنائے گا اب کون

حالی سے منسوب فرضی عربی رسالہ کی حقیقت:

حالؔی کے سوانح نگاروں نے ایک عربی رسالہ کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے اٹھارہ برس کی عمر میں دہلی میں لکھا جو ان کی پہلی تصنیف تھی۔ خواجہ غلام الثقلین نے اپنے ایک مضمون میں اس کا یوں ذکر کیا ہے:

> ''غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیر تعلیم تھے۔ اس زمانے میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا۔ جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خان بہادر کی تائید میں تھا۔ جسے

اُن کے استاد نے پڑھ کر نہایت ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ اُسے چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن استاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش مدرسے میں پڑھاتے تھے کہا کہ رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر چوں کہ ایک وہابی مولوی کی تائید میں تھا، اس لیے چاک کر دیا گیا۔''

ہماری نظر میں مختلف حوالوں اور شواہد کی موجودگی میں اس عربی رسالہ کا وجود مشکوک معلوم ہوتا ہے اگرچہ اس کی تائید صالحہ عابد حسین اور مالک رام نے بھی خواجہ غلام الثقلین کے مضمون ہی سے کی ہے۔ یہ مسئلہ اس لیے تحقیق طلب ہے کہ

الف۔ عربی رسالہ کا نام اور اس کی ضخامت اور متن کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

ب۔ حالیؔ جب پہلی بار دلی آئے تو ڈیڑھ سال رہ کر پانی پت واپس ہو گئے۔

ج۔ حالی کی عمر جب سترہ اٹھارہ برس تھی تب ان کی عربی ادب استطاعت ایسی نہ تھی کہ کوئی رسالہ تصنیف کر سکیں کیوں کہ وہ خود اپنی کہانی میں لکھتے ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے بعض محققین مفروضے کو یقین کا درجہ دے کر اُس پر قیاس کی عمارت تعمیر کر دیتے ہیں۔ اگر انھیں میدان تحقیق میں ایک منحنی سوراخ شدہ لوہے کا ٹکڑا نظر آ جائے تو اس کو گھوڑے کی نعل بتا کر گھوڑے اور سوار کا نام بھی بتا دیتے ہیں اور عجب نہیں کہ جنگ کا نقشہ بھی کاغذ پر اعتماد کے ساتھ کھینچ دیں۔ دوسری جانب پڑھنے والے ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا'' کا منتر پڑھ کر خطا اور غلطی میں فرق کرنے کی غلطی کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے:

''کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم و ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور خاص کر علم و ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے۔'' (۱۱)

اس وقت حالیؔ کی عمر چوبیس سال تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں بغیر کسی مدد کے ایک دقیق اور ادق مسئلہ پر رسالہ تصنیف کریں اور وہ بھی عمدہ عربی میں جس کی داد استاد نے دی لیکن چوں کہ متن سے اختلاف تھا تو چاک کر دیا۔

د۔ حالیؔ نے خود کسی تصنیف، تحریر، تقریر میں ایسی کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ مالک رام نے اس قصے کو مزید رنگ دے کر یہ بھی لکھا کہ

''کتابچہ لکھنے کی یہ پہلی کوشش تھی لیکن استاد کی ناراضیگی سے ان کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس واقعہ کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے دس سال تک کچھ نہیں لکھا اور وہ بالکل خاموش رہے۔ اس کے بعد بھی انھوں نے کوئی ایسی کتاب نہ لکھی جس سے کسی دوسرے

فرقے کی دل آزاری ہو۔'' (۱۲)

ہ۔ حالؔی نے عربی نثر و نظم لکھنے کی ابتدا ۱۸۶۳ء کے بعد جہانگیر آباد میں کی جہاں وہ شیفتہ کے مصاحب اور ان کے بیٹوں کے اتالیق تھے۔ حالؔی نے ضمیمۂ کلیات حالی اپنی زندگی کے آخری دور میں یعنی ۱۹۱۴ء کے اواخر میں ترتیب دیا جس میں ان کا پراگندہ فارسی اور عربی نثری اور منظوم کلام شامل ہے۔ حالی اس ضمیمہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> انہی دنوں میں تنہائی اور قلت مشاغل کے سبب عربی ادب کی ہوس دل میں چٹکیاں لینے لگی، اگرچہ علم ادب کسی استاد سے باقاعدہ پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اور نہ کسی ادیب سے اصلاح لینے کا موقع ملا تھا مگر چوں کہ لٹریچر سے فی الجملہ مناسبت تھی کبھی کبھی ڈکشنریوں کی مدد سے ادب کی آسان آسان کتابیں دیکھنے لگا۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عربی نظم و نثر پر خود رومبتدیوں کی طرح ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہوئی۔ (۱۳)

یہ ضمیمہ مقدمے کے ساتھ اگست ۱۹۱۴ء میں مولانا یعقوب مجددی پانی پتی کی سفارش سے حافظ عبدالستار بیگ نے اپنے مطبع تحفہ ہند پریس دہلی میں شائع کیا۔ اس اشاعت کے تقریباً چار مہینے بعد ۱۳ صفر ۱۳۳۳ ہجری مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو حالی کا انتقال ہوا۔ حالؔی کی اس تحریر کے بعد اس بات کی مزید گنجایش باقی نہیں رہتی کہ انھوں نے سترہ برس کی عمر میں ایک منطقی رسالہ عربی میں تصنیف کیا تھا جب کہ چوبیس برس کی عمر میں انھوں نے عربی سیکھنی شروع کی۔

و۔ محمد مشتاق تجاوری بھی ایسے کسی عربی رسالے کی تصنیف کو صحیح مانتے وہ لکھتے ہیں:

> ''نواب صدیق حسن خان اور احناف کے درمیان اختلافات فقہی نوعیت کے تھے منطقی نہیں بلکہ نہ نواب صدیق حسن خان منطقی تھے اور نہ مولانا حالی اس لیے مولانا ان کی حمایت میں منطق کا کوئی رسالہ لکھنا عقلاً متبادر نہیں ہوتا۔'' (۱۴)

حالی کی پہلی تصنیف ''مولود شریف'' کا اجمالی تذکرہ:

مولود شریف حالی کی پہلی تصنیف ہے جو اگرچہ ۱۸۷۰ء سے پہلے تصنیف ہوئی مگر حالی کی زندگی میں چھپ نہ سکی۔ ملک رام نے اسے ۱۸۶۴ء کی تصنیف بتایا ہے (۱۵) مگر یہ حوالہ نہیں دیا کہ انھیں یہ تاریخ کہاں سے ملی جب کہ حالی کے بیٹے نے اس کی تاریخ نہیں بتائی۔ حالی کے نواسے خواجہ فرزند علی نے ۱۳۴۲ ہجری میں اپنے مطبع حالی پریس سے شایع کیا۔ یہ کتاب (۹۸) صفحات پر مشتمل ہے جس میں حالی کے چھوٹے فرزند سجاد حسین کی دو صفحہ کی تمہید، مطبوعہ اور زیر طبع کتابوں کا اشتہار کے ساتھ پبلشرز کا نوٹ بھی ہے کہ حالی پریس کا مقصد حالی کی تمام تصانیف کو سلسلہ وار ایک تقطیع پر پوری صحت کے ساتھ شایع کرنا ہے۔ خواجہ سجاد حسین لکھتے ہیں:

> حال ہی میں والد مرحوم کے کاغذات میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مجلد مسودہ مولود شریف کا

دستایب ہوا جو نقل کر کے مطبع کے سپرد کیا گیا۔ مسودے کے آخر میں مولانا مرحوم کے دستخطی یہ الفاظ ہیں: کاتبہ ومولفہ، محمد الطاف حسین عفی عنہ (۱۵)

موصوف کی زندگی میں مولود شریف کے نہ چھپنے کے دو سبب ہو سکتے ہیں اوّل تو غالبًا کتاب چھپنے کا انتظام نہ ہو سکا یا بعد میں یہ خیال مانع ہو کہ ولادت شریف کے متعلق جو روایات لکھی گئی ہیں اور جس پیرائے مین ان کو تالیف کیا گیا ہے وہ اس زمانے کے مناسب حال نہیں۔ اس کتاب کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی فنا فی عشق رسول ﷺ تھے۔ مولود نامہ میں قرآنی آیات احادیث نبوی ﷺ تاریخ اسلام کے واقعات سلیس شگفتہ اور پُر تاثیر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ حالی نے متن کو اشعار سے تزئین کیا ہے۔ عشق نبوی ﷺ کی علامتیں آیات قرآنی حوالوں سے پیش کرتے ہیں۔ اوّل علامت ہر بات میں اور ہر کام میں حضور نبی کریم ﷺ کی پیروی اور دل کی خواہشوں کو شرع کر تابع دار کر دینا۔ دوّم علامت محبوب کو ہر وقت یاد رکھنا اس کا نام محبت ہے:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

تیسری علامت آپ کا ذکرِ حُسن کر مراتب تعظیم وتکریم بجا لانا اور خضوع وخشوع اور عجز وانکساری کی صورت بن جانا۔ چوتھی علامت قرآن مجید کی تعظیم وتکریم ہے۔ کوئی شے ایمان کو مضبوط کرنے والی قرآن پڑھنے اور قرآن سننے سے زیادہ نہیں۔

پانچویں علامت مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی اور اُن پر شفقت اور ان کی مشکلوں میں کام آنا۔ چھٹی علامت یہ ہے کہ آدمی جانور درخت پتھر شہر مسجد کنواں اور اس کے سوا جس شے کو بھی حضرت کے ساتھ کچھ نسبت ہو اس کی محبت اور تعظیم بعینہٖ آپ کی محبت اور تعظیم ہے۔ کہیں کہیں کچھ اُردو فارسی اور عربی کے اشعار نظر آتے ہیں۔ کتاب کا خاتمہ مناجات پر ہے۔ حالی کے دو شعر جو اسی کتاب میں ہیں اُن پر اس مختصر ریویو کو تمام کرتے ہیں:

اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربت مرگ پیوں نہ آبِ بقا عمر جاوداں کے لیے
اگر بقیع میں گز بھر زمیں میسر آئے کروں نہ طول عمل روضہ جناں کے لیے

حالؔی کے مخالفین کی نقاب کشائی:

لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی (واجد علی شاہ)

یہ سچ ہے کہ اس مختصر گفتگو میں حالی کے سارے مخالفین کا ذکر ممکن نہیں۔ حالی کے دوست بے شمار تھے لیکن دشمنوں اور مخالفوں کی کمی بھی نہ تھی۔ ان کے مخالفین میں مذہبی و غیر مذہبی اور دوست نما دشمن شامل تھے۔ حالی کی مخالفت کی ایک خاص وجہ ان کی سر سید سے دوستی، علی گڑھ تحریک سے وابستگی اور سر سید کی سوانح، حیات جاوید کی تصنیف تھی۔ ہماری اس تحریر میں چند پردہ نشین مردوں کے نام بھی آئیں گے جو ظاہراً دوستی کا دم بھرتے تھے لیکن ان کے دل حالی سے صاف نہ تھے۔ بقول میر انیس:

''میں نے تو ایک دل بھی نہ دیکھا جو صاف ہو۔''

حالی کی علمی مخالفت ادیبوں اور شاعرون کا مرغوب مشغلہ تھا۔ اگر چہ سرسید، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ محمد اقبال کی طرح حالی پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا گیا مگر حالی کی شخصیت اور فن کو مسلسل نشانہ بنایا گیا۔ حالی کے دور کے سیاہ اوراق آج بھی موجود ہیں۔ مذہبی لوگ حالی کو سرسید کی بانسری اور نیچری کہتے تھے۔ حالی نے جو اردو شاعری کی پاکیزگی کی مہم کو اپنا شعار بنایا تھا وہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو کھلتا تھا کیوں کہ وہ حالی کو اہل دلی اور لکھنؤ نہیں مانتے تھے۔ وہ حالی کو پانی پت کا ایک معمولی شاعر جانتے تھے:

دلّی دلّی کیسی دلّی
پانی پت کی بھیگی بلی

حالی کی مخالفت ان کی موضوعاتی نظموں سے شروع ہو چکی تھی۔ مسدس حالی کی عوام میں پذیرائی ان کے مخالفین کے لیے خطرے کی گھنٹی محسوس ہو رہی تھی جو فن برائے فن وہ بھی بطور تفنن کے قابل تھے۔ حالی ایسی شاعری کو عفونت میں سنڈاس سے بدتر بتا رہے تھے اور ایسے شاعروں کی موجودگی یا غیر موجودگی سے متاثر نہ تھے جیسا کہ انھوں نے مسدس میں علانیہ کہا تھا:

یہ ہجرت جو کر جائیں شاعر ہمارے
کہیں مِل کے خس کم جہاں پاک سارے

مقدمہ شعر و شاعری میں چوماچاٹی کی شاعری پر شدید ردعمل نے لکھنؤ اور دلی کے رومانی شعرا کو حالی کے مقابل کر دیا۔ درجنوں حالی کو دشنام اور نازیبا خطوط ملنے لگے۔ مختلف روزنامے اور رسالے مستقل طور پر حالی کے خلاف صف آرا ہو گئے جن میں حسرت موہانی کا اردوے معلّی اور سجاد حسین لکھنوی کا اودھ پنچ پیش پیش تھے۔ حالی کے خلاف سوقیانہ ہجو لکھی جانے لگیں۔ اودھ پنچ کے سرورق پر کئی سال تک یہ شعر چھپتا رہا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے (۱۷)

حالی کو خالی، جعلی، مالی، خیالی اور ڈفالی جیسے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ لکھنو اور دلّی کے اہل زبان کہتے تھے:

> یہ پانی پتی شخص کس جرأت سے اہل زبان کے ہم زبان ہی نہیں بلکہ مسیحائے زبان ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

حالی ان تمام حملات کا خاموشی سے جواب دے رہے تھے اور ہمہ تن دن رات چمنستان شعر کی پاکیزگی میں مصروف تھے۔

اردو دنیا اور دنیائے ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معاصرین پر تخریبی تنقید نظر آتی ہے۔ جیسے والٹیر کا حملہ شیکسپیئر پر گوئٹے کا حملہ ڈانٹے پر، رشید وطواط کا حملہ خاقانی پر، فرضی کا حملہ فردوسی پر، احراری کا حملہ سعدی پر، سودا کا حملہ میر پر، شیفتہ کا حملہ نظیر پر، رجب علی بیگ کا حملہ میرامن پر وغیرہ۔

چناں چہ ہر ادب اور ہر دور میں تخریبی تنقید نظر آتی ہے۔ یہاں ہم حالی کے چند معاصرین کی معاندانہ تنقید کو

مستند حوالوں سے درج کرتے ہیں۔ حسرت موہانی اردوئے معلّٰی میں حالی پر سخت اعتراضات کرتے تھے۔ ایک اسی قسم کا واقعہ تذکرہ حالی میں شیخ اسماعیل پانی پتی نے یوں لکھا ہے:

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے اور حسب معمول سیّد زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ اک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چند اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سیّد صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے میں سے حسرت کو دیکھا۔ اُنھیں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور اردوئے معلّٰی کے دو تین پرچے اُٹھا لائے۔ حسرت اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور اردوئے معلّٰی کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے...... کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ خوب لکھا ہے کہہ کر داد دیتے ...... حالی بھی، ہوں ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے...... اتنے میں سیّد صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے:

''ارے مولانا یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے''

اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخربِ زبان کوئی نہیں ہو سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روک لیں۔ اُتنا ہی اچھا ہے۔ فرشتہ منش حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا:

''اب بھی حالی کے خلاف کچھ لکھو گے؟''

جواب دیا:

''جو کچھ لکھ چکا اُسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔''

حالی کا یہ ضبط، وقار اور عالی ظرفی بڑے بڑے مخالفوں کو شرمندہ اور نقاد کو پشیمان کر دیتی تھی۔ (۱۸)

جب حالی کی شاہکار کتاب **حیاتِ جاوید** شایع ہوئی تو شبلی نعمانی نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مولوی عبدالحق **چند ہم عصر** میں لکھتے ہیں:

جب میں نے حیاتِ جاوید کا ایک نسخہ ان کو دیا تو دیکھتے ہی فرمایا: ''یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے۔

یہ جملہ سن کر عبدالحق دم بخود رہ گئے کیوں کہ پڑھنے سے پہلے ایسی سخت رائے کیا معنی رکھتی تھی۔

شبلی حبیب الرحمان خان شیروانی کے خط میں حیاتِ جاوید کو کتاب المناقب لکھتے ہیں۔ **ایک اور خط میں** شیروانی لکھتے ہیں:

> وہ محض دعوے کرتے ہیں واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے بہرحال میں ''حیاتِ جاوید کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔

شبلی اپنے شاگرد عبدالسمیع کو حیات جاوید پر منفی ریویو کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> میں کچھ مزید نہیں کہنا چاہتا تم مقلد نہیں مجتہد ہو پھر تقلید کیوں؟

اب آئینہ کا دوسرا رخ حالی کا کریکٹر دیکھیے جسے عبدالحق نے اپنی کتاب **چند ہم عصر** میں دکھایا ہے:

> ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا حالی سے ملنے آئے اس زمانے میں وہ **دکن ریویو** نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔(۱۹)

وحید الدین سلیم پانی پتی جنھیں حالی نے دنیائے اردو میں معروف کیا وہ بھی حیاتِ جاوید کے بارے میں صدر یار جنگ حبیب الرحمان خاں شیروانی لکھتے ہیں:

> حالی نے دیباچہ میں جس امر کا وعدہ کیا ہے اس کو وہ ایک شمہ بھی پورا نہیں کر سکے۔ جہاں انھوں نے سرسید کی تفسیر کی بحث کی ہے یہ کہتے ہوئے کہ بحث طولانی ہو جائے گی ادھورا چھوڑ دیا ہے۔

بقول رشید حسن خان کہ

> حالی کو غالب کے بہت سے واقعات کا علم تھا وہ اگر اپنے طور پر ان کو لکھتے تو بعض ایسی باتیں ضرور بیان میں آ جاتیں جو ان کے نزدیک وضاحت طلب نہیں تھیں۔ اس الجھن اور اس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ طریقہ انھوں نے اختیار کیا کہ بعض اہم واقعات کے بیان میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے خود مرزا صاحب کے بیانات کو نقل کر دیا اس طور سے سوانح نگار کی حیثیت سے ان کے کسی بیان کا جائزہ نہیں لیا اس طریقہ کار نے کئی واقعات کی واقعی شکل وصورت کو سامنے آنے نہیں دیا۔(۲۰)

سچ تو یہ ہے کہ

''لعن وطعن، گالی، دشنام، طنز واعتراضات کے طوفان کو حالی نے ایک نرالے طریقے سے زیر کیا

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا اُنھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے، مخالفت کا یہ طوفان جو خس و خاشاک کی کائنات تھا، جلد ہی دب گیا اور حالی کی عظمت اور شان اپنی جگہ قائم رہی۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

اردو تنقید پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ اس کے ناقدین عموماً سکے کے دو رخ پیش نہیں کرتے یا تو سراسر مدح ہو گی یا پھر ہر لفظ میں ذم وقدح کا پہلو ہوگا۔ حالی کی حیات جاوید پر اعتراض کرتے ہوئے شبلی نعمانی نے کہا تھا یہ کتاب المناقب ہے مدلل مداحی ہے جب کہ خود شبلی نے جب موازنہ انیس و دبیر لکھا تو انیس کی مداحی اور دبیر کی قداحی لکھی۔ حالی نے اپنی تینوں سوانح عمریوں میں یعنی حیات سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید ان تینوں بزرگوں کی مدحت آرائی کی ہے اور خود اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ ابھی برصغیر میں کریٹکل بیوگرافی کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہم کہتے ہیں حالی سے تسامح ہوا ہے اگر وہ تذکرے دیکھ لیں تو معلوم ہوتا کہ تذکرہ نویس نے کس طرح تخلیق کار کی شخصیت اور تخلیق کا ناحق خون کیا ہے۔

کیا حاؔلی کے استاد مصطفیٰ خان شیفتؔہ نے نظیؔر اکبرآبادی کے ساتھ ظلم نہیں کیا؟ کیا گلشن بے خار خارداری کی وجہ سے گلشن بے کار نہیں ہوا؟ اصلی تخلیق کار ایک پہاڑ ہوتا ہے اگر ناقد اس سے سر ٹکرائیں تو سر پھوٹتا ہے پہاڑ نہیں ٹوٹتا۔ ہم نے حالی کی شاعری اور ان کے نثری کلام پر ناقدین کے دونوں رخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن نقادوں نے رسمی طور پر ایک دو جملے تعریف کے لکھ کر منفی بافی کا دفتر کھولا ہے جس میں انصاف سے کام لینے کے بجائے ذاتی فکر و تجربہ سے اخذ کردہ تنقیص اور ذم کا پہلو دکھایا گیا ہے جو علمی عقلی اور منطقی حوالوں سے ثابت نہیں ہوسکتا۔ ان ناقدین میں احسن فاروقی، وحید قریشی اور کلیم الدین احمد سرفہرست ہیں۔ ان ناقدوں نے نوک خار سے گل تخلیق کو تار تار کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

حالی کے منظوم اور نثری کلام پر کئی تبصرہ نگاروں نے کلیم الدین احمد کے تند و تیز جملے نقل کیے جنھیں بعض مقامات پر توڑ موڑ کر کچھ جوڑ کر اور کچھ چھوڑ کر اسی طرح بیان کیا کہ مسائل پر پوری روشنی نہیں پڑھ سکی۔ اس لیے ہم کلیم الدین احمد کے ایک طویل مضمون حالی سے جو ان کی کتاب **اردو پر تنقید پر ایک نظر** میں شامل ہے۔ اقتباسات بغیر کسی متن کی تحریف کے یہاں لکھ کر حالی کے مقدمہ اور شعر و شاعری کے بارے میں ان کا نظریہ پیش کر رہے ہیں جہاں وہ حالی کی معمولی سی مغربی شاعری اور تنقید کی سہل انگاریوں یا ان سے واقفیت کو جرم سنگین بتا کر ان کی شخصیت اور تصنیف کا بیہمانہ قتل کرتے ہیں۔ ان کی تنقید دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے حالی کے تمام تر کلام کا مطالعہ کیا ہے۔

کلیم الدین احمد حالی کو اردو تنقید کے بانی، اُردو کے بہترین نقاد جن کی نثر بلند پایہ ہے بتاتے ہیں:

اردو تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے ''پرانی تنقید'' محذوف ومقصود کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت اسناد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غور وفکر کیا۔ شعر و شاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔ اپنے زمانہ، اپنے ماحول اپنے حدود میں حالؔی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔ وہ اردو''تنقید'' کے بانی بھی ہیں اور اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اس سے حالی کی تحقیر مقصود نہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت اظہر من الشّمس ہے۔ ان کی نثر بلند پایہ ہے، ان کا خلوص زبردست ہے۔ (۲۱)

پھر لکھتے ہیں:

شعر وشاعری کی اہمیت کا صحیح اندازہ حالی کے بس کی بات نہیں وہ کہتے ہیں:

''شعر کی مدح و ذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جس قدر اس کی مذمت کی گئی ہے وہ بہ نسبت مدح کے زیادہ قرین قیاس ہے۔

وہ افلاطون کے ہم خیال ہیں اور شاعری کو غیرضروری سمجھتے ہیں۔ یوں کہتے ہیں کہ شاعری کا ملکہ بے کار نہیں ہے لیکن ان کے خیال میں شاعری محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ شاعری کوئی دلچسپ کھیل نہیں، وہ تو انسان کی بہترین دماغی تحریکات کا آئینہ ہے۔ اس سے کامل سکون، ایک ابدی سرور ملتا ہے جو اور کسی چیز سے نہیں ملتا اور نہ مل سکتا ہے۔ یہ بہترین فن ہے جس کی برابری کوئی دوسرا فن نہیں کر سکتا۔ اس کا مقام سائنس اور فلسفہ سے بھی بلند ہے بعض نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مستقبل میں مذہب کی جگہ لے لے گی۔ افسوس ہے تو یہی کہ آج بھی کہنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ شاعری تفنن طبع کا ذریعہ نہیں۔ اس کے آئینہ میں مادی اور روحانی دنیا اور اس دنیا کے بنیادی اور پایدار قوانین کا صاف، مکمل اور پرسکون عکس ملتا ہے حقیقت اور اس کی پراسرار کارفرمائیاں اسی آئینہ میں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی حالی کو خبر نہ تھی وہ شعر وشاعری کی اہمیت اور قدر وقیمیت سے واقف نہ تھے اسی لیے دوسرون کو ان چیزوں سے آگاہ کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ (۲۲)

جس شخص نے بھی حالی کا مقدمہ پڑھا ہے ان کے مسدس کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی نظموں کا تاثیری اثر جذب کیا ہے کیا وہ ان گول مٹول جملوں سے مرعوب ہوسکتا ہے:

حالؔی نے مغرب سے استفادہ کیا۔ اس استفادے کا نتیجہ جو ہوا ظاہر ہے شاعرانہ فطرت کی خصوصیات اور شاعری کی اہم صفات پر حالی کی پوری بحث پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ جتنی زیادہ یہ بحث اہم ہے حالی اتنے ہی زیادہ اس پر طبع آزمائی کے لی

نااہل ہیں۔ جن علوم کی قابلیت اور جن فطری صلاحیتوں کی اس سلسلہ میں ضرورت تھی وہ ان میں نہ تھیں۔ وہ ایک بحر بے کراں میں بے خطر کود پڑے ہیں اور ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں مگر ان کا کود پڑنا اور ہاتھ پاؤں مارتے رہنا ہی اہم ہے۔ ان کی تمام بحث کی یہ نوعیت ہے جیسے کہ کسی بری، مکمل اور مربوط تصنیف میں سے کوئی طالب علم کوئی ادھر کی اور کوئی ادھر کی بات نوٹ کرے اور یہ سمجھے کہ وہ پوری کتاب پر حاوی ہو گیا۔ (۲۳)

افسوس یہ ہے کہ یہ حالی ہی تھے جنھوں نے اُردو ادب کو مغربی قدروں اور لٹریچر سے روشناس کروایا۔ اگر آزاد و حالی نہ ہوتے تو کلیم الدین احمد کا وجود نہ ہوتا جنھیں یہ غصہ ہے کہ حالی اس مغربی دریا میں کیوں اُترے اور اگر اترے تھے تو کیوں نہ پورا دریا تیرا کی کی۔ حالی نے کہیں یہ بات بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں کہی کہ انھوں نے مغربی لٹریچر پر عبور حاصل کیا وہ تو صرف مغربی قدروں کی نشان دہی اور مختصر تعارف کر کے چلے گئے۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

حالی فینسی اور امیجینیشن میں امتیاز نہیں کر سکتے لیکن جو تعریف انھوں نے لکھی ہے وہ بھی نامکمل اور ادھوری ہے۔ (۲۴)

وہ لکھتے ہیں:

اگر مقدمے کو خضر راہ سمجھیں تو ترقی ممکن نہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ آج جب لکھنے والوں کا مطمع نظر حالی کی طرح محدود نہیں جب وہ بہترین مغربی ادب، تنقیدی ادب سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی نے بھی **مقدمہ شعر و شاعری** سے بہتر تنقیدی کارنامہ پیش نہیں کیا۔ یہ خیال ہے کہ **مقدمہ شعر و شاعری** اردو میں بہترین تنقیدی کارنامہ ہے۔ نہایت حوصلہ شکن ہے۔

حالی کے کلام کے تابوت پر کلیم الدین احمد نے آخری کیل یوں ماری:

خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی غور و فکر کا ناکافی تمیز ادنیٰ دماغ و شخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کائنات۔ (۲۵)

ہم صرف یہی کہیں گے کہ تنقید نگار کو جذباتی نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کی ناقدانہ رائے قبول نہیں ہوتی۔ کلیم الدین احمد کی رائے کو اکثر اس لیے پیش کرتے ہیں کہ ان تمام عیوب کے باوجود حالی عمدہ ترین تنقید نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں اور مقدمہ شعر و شاعری علمی تنقید کی پہلی معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اگر مرغ یہ سمجھیں کہ اس کے ککڑکوں نہ کرنے سے سورج طلوع نہ ہوگا تو مرغ کی خوش فہمی ہے۔ اردو تنقید کا کاروان اپنی ارتقائی منازل پر گامزن ہے۔

شعر کی تاثیر کو ثابت کرنے کے لیے جو مثالیں حالی نے دیں کیا وہ آج بھی ضرب المثل نہیں ہیں۔ یہاں کون ناسمجھ ہے ذیل کی عبارت پڑھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے:

شعر کی تاثیر کو ثابت کرنے کے لیے وہ بہت سی مثالیں بھی دیتے ہیں۔ چھے مثالوں سے ان کی ناسمجھی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس ناسمجھی سے قطع نظر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ جس تاثیر کا وہ

ذکر کرتے ہیں وہ اہم نہیں۔ شعر کا مقصد جذبات کو بھڑکانا نہیں ہے۔ شاعری جذبات کی تعلیم و تربیت کرتی ہے۔ انھیں برانگیختہ نہیں کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ شاعری کا اثر ہنگامی نہیں پائیدار ہوتا ہے۔ اس سے ہماری روحانی، جذباتی اور جسمانی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اچھے شعر جذبات کو بھڑکاتے نہیں ہیں اور جو شعر جذبات کو بھڑکاتے ہیں وہ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ حالی کا معیار مادی ہے۔ وہ شعر کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا سبب یہی مادی معیار ہے وہ شعر کی تاثیر اور اس کے فائدہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس خوش فہمی کا سبب بھی یہی مادی معیار ہے۔ (۲۶)

شعر کی ماہیت سے بھی وہی بے خبری ہے جو شعر کی اہمیت سے تھی۔ حالی صرف میکولے کا قول نقل کرتے ہیں۔ میکولے کی نقاد کی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں۔ اس کے قول کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں میکولے کے خیال میں (اور یہ خیال بھی ماخوذ ہے) شاعری ایک قسم کی نقالی ہے۔ ''یہ نقالی فن مصوری یا نقاشی کے مقابلہ میں نامکمل ہے لیکن اس کی دنیا وسیع ہے''، خصوصاً انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلم رو ہے۔

میکولے کا یہ قول بھی صحیح نہیں کہ ''نقالی فن مصوری یا نقاشی کے مقابلہ میں نامکمل ہے۔'' اگر آنکھوں کی تسکین کو معیار سمجھا جائے تو اس قول میں صحت ہو سکتی ہے لیکن آنکھوں اور کانوں کی تسکین کو کامل تسکین نہیں سمجھ سکتے ہیں یہ تسکین ادھوری سی ہوتی ہے۔ اس میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہماری دماغی اور روحانی زندگی، ہمارے جذبات اور احساسات کو جو تسکین شاعری میں ملتی ہے، وہ کسی دوسرے فن لطیف میں نہیں ملتی اور نہ مل سکتی ہے۔ میکولے کو اس حقیقت کا احساس نہ تھا اور حالی میں بھی اس احساس کی کمی نظر آتی ہے، شاعری کے لیے جو شرطیں حالی ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی سطحی اور کورانہ طور پر اخذ کی گئی ہیں۔ یہ شرطیں تین ہیں، تخیل کائنات کا مطالعہ، تفحص الفاظ۔

کلیم الدین احمد کولرج کے مقلد ہیں۔ وہ میکولے کے قائل نہیں اس لیے تمام غصہ بے چارے حالی پر نکالتے ہیں۔ مغربی نقادوں کے نظریات میں مشرقی نقاد کی طرح اختلاف رائے موجود ہے۔

تنقید کا کھیل دو اور دو چار نہیں ہوتا۔ اگر تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تشخص الفاظ سطحی شرطیں ہیں تو پھر اصلی شرطیں کلیم الدین احمد کیوں بیان نہیں کرتے۔

وارث علوی حالی **مقدمہ اور ہم** میں لکھتے ہیں:

نقاد جب حوالداروں کی طرح بات کرنا شروع کرتا ہے تو اس کا طرزِ گفتگو بھی کتنا غیر شریفانہ بن جاتا ہے۔ جوشِ تنقید میں انھیں یہ تک خیال نہیں رہتا کہ حالی جیسے نقاد پر قلم اٹھاتے وقت ہمیں آداب گفتگو کی پاس داری کرنی پڑتی ہے۔ حوالداری سے میرا کیا مطلب ہے اسے سمجھنے کے لیے محمد احسن فاروقی کے یہ جملے دیکھیے جو ان کی مقدمہ پر تنقید سے جستہ جستہ انتخاب کیے گئے ہیں:

ایسی باتیں پڑھ کر تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ایسا شخص کس طرح شاعری کرنے اور شاعری پر

رائے دینے کا اہل ہی نہیں ہوسکتا۔

اس اخلاق کی وکالت میں انھوں نے برے دھوکے کھائے ہیں اور تنقید نگاری کی بہت ہی غلط مثالیں قائم کی ہیں۔ اس کی بدترین مثال مقدمہ کا وہ حصہ ہے جس میں مراثی کی اخلاقی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے۔

یہاں وہ تنقید نگاری کے نقطۂ نظر سے ایسا جرم کر رہے ہیں جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم علم کس قدر پرخطر ہوسکتا ہے۔

جتنی زیادہ یہ بحث اہم ہے، حالی اتنے ہی زیادہ اس پر طبع آزمائی کے لیے نااہل ہیں۔

اگر احسن فاروقی مقدمہ کو ذرا غور سے پڑھتے تو حالی کا اسلوب نگارش انھیں آداب تنقید بھی سکھاتا۔ (۲۷)

اس طرح کا طرزِ بیان صرف فاروقی تک محدود نہیں بلکہ کلیم الدین احمد کہیں مقدمے کی تعریف کرتے ہوئے حالی کی نثر کے بارے میں اُسے انفرادی خصوصیتیں عطا کرتے ہیں کہ

حالی نے صاف اور سادہ طرزِ ایجاد کی لیکن اس طرز میں بے رنگی نہیں پھیکا پن نہیں اس میں ایک لطافت ہے ایک جاذبیت ہے ایک رنگینی اور یہ تنقیدی مسئلوں پر بحث کرنے کے لیے موزوں بھی ہے۔

پھر حالی کی تنقید کے ہر جملے کو مغربی ترازو پر تولتے ہیں، اور اس میں جو کچھ کم و کسر ہے اُسی کو سب کچھ بتا کر فتوے صادر کرتے ہیں۔

وحید قریشی لکھتے ہیں:

ادبی مسائل میں جہاں کہیں بھی دو بزرگوں میں اختلاف کا موقع آیا، حالی اپنے اعتدال کا ترازو لے کر آ گئے۔ حالی کی دوکان داری کا یہ انداز ان کی صلح جو طبیعت کا ترجمان اور ان کی شخصیت پرستی کا آئینہ دار ہے۔ لیکن ان ہی دوراہوں پر ان کا تنقیدی نظام متزلزل نظر آتا ہے۔ شاعری شائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے یا ناشائستگی کے زمانہ میں اس پر انھوں نے مقدمے میں طویل بحث کی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ ہر دو رآرا مغرب سے آئی تھیں۔ جس کی پیروی کی انھوں نے قسم کھا رکھی تھی۔ مرحلہ نازک تھا لیکن فیصلہ قطعی، اس لیے دونوں کو خوش کرنے کے خیال سے اور احترام کی خاطر انھوں نے درمیان کی راہ نکالی کہ پہلی بات بھی کسی قدر صحیح اور دوسری بھی۔ (۲۸)

سرسید کا مرثیہ، حالی کی زبانی سنیے!!

سچ ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

یہ مرثیہ حالی کے فن اور ان کے سرسید سے خلوص کا شاہکار ہے۔ حالی نے سرسید کے مرثیہ کو فارسی میں ترکیب بند کے ساتھ بندوں میں تخلیق کیا جس کے ہر بند میں دس شعر ہیں۔ یہ مرثیہ ایرانی شاعر محتشم کاشی کے مرثیے کی بحر میں ہے۔ یہ فارسی کا مرثیہ مئی ۱۸۹۸ء میں مطبع مجتبائی دہلوی سے شایع ہوا۔ مرثیہ کے پہلے حصے میں سرسید کے انتقال سے جو رنج و غم کی لہر برصغیر میں پھیلی اور ان کی کمی سے جو شدید نقصان قوم کو ہوا اس کا ذکر بڑے ہی خوبصورت اور پرتاثیر انداز میں کیا ہے جو ان کی قلبی واردات اور فن پر مہارت کی دستاویز بھی ہے:

اے عجب کز مردنِ یک پیر مردِ سال خورد تب و ب در کودک و پیر و جواں انداختند
اے عجب کز سوزِ اندوہِ وفات مسلمے مردم ہر کیش را آتش بجاں اند اختند
سید اندر قوم نقدے بود اندر کیسہ کیسہ خالی ماندہ و نقد از میاں انداختند
قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت بعد ازاں کایں گنج را در خاکدان انداختند (۲۹)

یعنی تعجب ہے کہ ایک بڑھے کے مرنے سے اضطراب اور بے چینی بچوں جوانوں اور بزرگوں میں پھیل گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان کی موت نے ہر قوم و ملت کے لوگوں کے دلوں کو جلا دیا ہے۔ سرسید قوم کی تھیلی کی نقدی تھے چناں چہ نقدی گر گئی اور اب تھیلی خالی ہے۔ قوم کی تعمیر اور عظمت کی دولت ہاتھ سے نکل گئی اور بعد میں اُسے خاک میں دفن کر دیا گیا۔

سرسید نے تمام عمر ملت اور دین کی حفاظت کی یہی ان کا حج تھا یہی روزہ اور یہی ان کی نماز وہی قوم کا سید اور سردار ہے جو قوم کا خدمت گزار ہے یقیناً سرسید کی سیادت اس کی گواہی بھی دے رہی ہے۔

در مصافِ دہر بودن دین و ملت را سپر حج او ایں بود اینیش صوم و ایں بودش صلوٰۃ
سید القوم ست ہر کس قوم را خدمت کند خدمت او بر سیادت بس بود او را گواہ

حالی مرثیے کے تیسرے بند میں انسان بننے کی اہمیت کو بہت خوب صورت تمثیلوں اور تلمیحوں سے مضمون باندھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ حالی کہتے ہیں کوئی فضل وعلم میں نابغۂ روز ہوسکتا ہے۔ کوئی فصاحت میں مثل سحبان یا عقل وحکمت میں لقمان جیسا بن سکتا ہے، دولت میں قارون کو پیچھے کر سکتا ہے سلطنت اور ثروت میں خسرو اور پرویز بن سکتا ہے۔ کہیں بہادری میں رستم تو کبھی قطب اور غوث سب کچھ ہوسکتا ہے مگر انسان ہونا دوسری چیز ہے۔

انسان وہ ہے جو ہمسائے کے رنج و درد سے بے تاب رہتا ہے۔ وہ جنت کی ہوا میں بھی محرومیوں کی زندگی سے افسردہ رہتا ہے۔ وہ دوسروں کے مقابل خود کو خوار و ذلیل محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل دکھ سے بھرا رہتا ہے اگرچہ شبستان ہی میں کیوں نہ ہو کیوں کہ وہ محنت کشوں کی زحمتوں کا احساس رکھتا ہے۔

می تواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن درفصاحت ہمچو سحباں ، در خرد لقماں شدن
می تواں در جاہ و ثروت گرے از قاروں ببرد می تواں در زہد و طاعت غیرت صنعان شدن

می تواں در ملک و دولت خسروِ پرویز گشت | می تواں در زور و طاقت رستم دستاں شدن
می تواں قطب زماں شد، می تواں شد غوث وقت | ہر چہ خواہی می توانی شد بجز انساں شدن
چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسائیگاں | از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن
خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس | در شبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

پھر ایک مضمون کو خوب صورت گریز سے دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔ قوم کی فکر میں زندگی گزارنا اور قوم ہی کے زندان میں گھٹ کر مر جانا اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ سرسید احمد خان بن سکتا ہے:

زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم | گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

حالی نے مرثیے کے چوتھے بند میں بتایا کہ سرسید کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ سرسید کو ہر طرح سے برا کہا گیا۔ سرسید پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا یعنی ایک پورا محاذ سرسید کے خلاف کھڑا کیا گیا لیکن سرسید کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی وہ شیر مردوں کی طرح اپنی داخلی روشنی اور حرارت سے کام کرتا رہا وہ محفل کو روشن رکھنے کے لیے شمع کی طرح خود پگھلتا رہا لیکن اپنے گھوڑے کی مہار آخری وقت تک منزل مقصود کے پہنچے تک تھا مارہا اگر چہ رستہ کانٹوں بھرا تھا حیف کہ نادانوں میں جو دانا تھا چلا گیا جو بنجر زمین میں میوہ دار درخت تھا اکھڑ گیا:

بود در امت بہ بدعت متہم از راستی | ارے ایں باشد دریں عالم سزائے راستاں
یار جز علمش نہ بود و علم دانی نا درست | ایں چنیں بے کس سزد کز جہل پردازد جہاں
بود یاراں را سپر تا بود در ہر شور و شر | لیک یاراں بر سرش تیغِ جفا می آختند
خواجہ در فکر صلاحِ دین و ملت در گزشت | لیک اہلِ دین و ملت قدر او نشناختند
کار کار شیر مردان است کز سوزِ دروں | بزم را افروختند و شمع ساں بگداختند
سید از رہ تا دم آخر عناں را بر نتافت | گرچہ در راہش بسے خار و خسک انداختند
حیف کا ندرِ جمع مستاں ہوشیارے بود، رفت | در زمین شور نخلے بار دارے بود، رفت

اے علی گڑھ! ذرا تو ہی بتا کس نے تجھے شہروں میں شہرت یافتہ کیا کس نے تیری خاک کو آسمان پر پہنچا دیا۔

اے علی گڑھ آں کہ کروت شہرہ درامصار، کو؟ | آں کہ از خاکت بہ گردوں بروآں معمار کو؟

حالی مصلح بھی ہیں مجدد بھی ہیں۔ وہ سب سے زیادہ قوم کی فکر میں ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ہمارے قدم رکنے نہ پائیں یہ تعلیمی تربیتی ادارے اسی طرح ترقی کے راستے پر گامزان رہیں۔ وہ مرثیہ کے آخری بند میں اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں جس کے لیے یہ سارا مرثیہ کہا گیا۔ وہ ملت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں سرسید نے دارالعلوم تمھارے لیے بنایا ہے تاکہ نسل در نسل دولت علم سے مالا مال رہے انھوں نے پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر نکالی ہے جو پانی نالے میں بہہ چکا تھا اُسے واپس لوٹا دیا ہے مجھے خوف یہ ہے کہ مخالفت کے زور سے یہ چشمہ کا پانی استعمال کے قابل نہ رہے ہاں یہی اور صرف یہی وقت ہے کہ ہم سب باہم متفق ہو جائیں۔ عزم و استقلال کے ساتھ کھڑے

ہوں ہاتھوں میں ہاتھ ہو اور ہماری کمریں کام کرنے کے لیے کسی ہوئی ہوں:

خواجہ دارالعلمے از بہر شما بگزاشت است — تا بود نسلِ شما از علم و دولت بہرہ ور
کوہ با کندہ است تا ایں جوے شیر آوردہ است — بو کہ آبِ رفتہ در جوے شما آید نز سر
ترسم ایں سرچشمہ گرود تیرہ از سنگ خلاف — بان وہاں وقت است ، وقتِ اتفاق ہم دگر
عزم جزم آرید و برخیزید و ہم دستاں شوید — دست بکشائید و بر بندید دامن بر کمر

جہاں تک زبان و بیان سوز و تاثیر زور و جذبات کا تعلق ہے یہ فارسی کا مرثیہ حالی کی فارسی تصنیف کا گل سرسبد ہے۔ یہاں تشبیہات کی ندرت استعارات کی لطافت ترکیبوں کی بلاغت اور لفظوں کی فصاحت حالی کی فارسی شاعری کا سکہ منوا رہی ہے۔

کیا حالی کی نثر نگاری سکّہ رائج الوقت ہے!!

حالی کی ادبی شعری اور نثری صلاحیتوں کو سنوارنے اور چمکانے میں جن چند اہم شخصیتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ان میں غالب شیفتہ ہالرائیڈ سرسید اور محمد حسین آزاد شامل ہیں۔ غالب، شیفتہ اور سرسید کے اثر سے ہم سب واقف ہیں۔ بال رائیڈ نے حالی کو مغربی لٹریچر کی دنیا کی سیر کروائی حالی کے لاہور کے قیام کے موقع پر مغربی شعر و ادب کے تراجم کی اصلاح مطالعے اور ایسی محافلوں میں شرکت کے مواقع سب اس اردو پرستار انگریز کے تاون ہی سے ہوئے۔ محمد حسین کی انجمن پنجاب، موضوعاتی مشاعرے، تذکروں کی ڈگر سے ہٹ کر نئے انداز کی تاریخی تنقیدی کتاب **آبِ حیات** کے فیض نے حالی کو پہلی علمی تنقیدی کتاب **مقدمہ شعر و شاعری** کا مصنف بنا دیا۔ چناں چہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آزاد اور حالی اُردو کے ایسے با قاعدہ نقاد تھے جن کی تنقیدی صلاحیتوں کو ترقی دینے اور اجاگر کرنے میں انجمن پنجاب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

مہدی افادی لکھتے ہیں:

> سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم لے سکتا ہے تو وہ حالی ہیں۔ (۳۰)

یہ بھی مسلم ہے کہ تحریر کی دلکشی اور رنگینی میں آزاد کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ لیکن ادبی اصلاح اور ادبی افادیت پر جہاں حالی قیام کرتے ہیں وہاں سرسید اور آزاد نہیں پہنچ سکتے۔ یہی فرق ہے غالب اور ذوق کے شاگردوں میں سرسید، آزاد اور حالی کی نیچر اور جدید شاعری کے پرستار تھے اور جب کبھی موقع ملتا ان کی تعریف کرتے۔ چناں چہ ایک مقام پر کہتے ہیں:

> حالی کی **مثنوی، حب وطن** اور **مناظرۂ رحم و انصاف** کو دورِ حاضرہ کی اخلاقیات کا تذکرہ سمجھنا چاہیے۔ ان کے خلوص کا سکہ سب کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی تنظیم بہتے ہوئے پانی کی طرح نرل اور رواں ہے۔ (۳۱)

حالی کی نثر اور نظم کے مطالعے سے ان کے خیالات اور طرزِ بیان کی ارتقائی منزلوں کا پتا چلتا ہے۔ جوانی میں

وہ ایک مولوی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس دور میں بھی انھوں نے عربی، فارسی، اُردو کے مطالعے کے ساتھ تاریخ اسلام، مسلمان قوم کی فلاکت اور برصغیر میں اسلام کی زبوں حالی کے اسباب کا مطالعہ کیا۔ پادری عماد الدین کی کتاب **ہدایت المسلمین** کے جواب میں تریاق مسموم اس کا ثبوت ہے۔ اس کتاب میں حالی کا لہجہ تیز اور تند ہے اور بقول پروفیسر احمد خان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی اپنے وقت کی مسلم کش تحریکات کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالی کا لہجہ مخلصانہ متین اور استادانہ بن جاتا ہے لیکن اس میں حق گفتاری کی آواز میں کمی نہیں ہوتی۔

حالی کے ہم عصروں میں کئی صاحب طرز تھے۔ ہر ایک کا ایک خاص اسلوب اور طرزِ نگارش تھا۔ ان میں سے بعض اردو ادب کو جدید چہرہ دے رہے تھے۔ حالی بھی اسی سخن کے میدان کے مرد تھے جن کا نثری میدان سوانح نگاری، تنقید اور علمی ادبی مقالات پر مشتمل تھا۔ حالی بھی اُردو ادب کے بے تکی رنگینی اور بے فایدہ صناعی مسجع اور مقفی، شاعرانہ تحریروں سے بے زار تھے اور اس طرزِ نگارش کو صاف سادہ سلیس شگفتہ رواں دواں عبارت سے بدلنے پر مصر تھے۔ وہ اُردو کے دامن کو یورپی لٹریچر کے گراں بہا جواہرات سے بھرنے میں سرگرم تھے جہاں وہ صاف ستھری ٹکسالی زبان لکھتے وہاں لفظ کی پاکیزگی اور محاروں کی صحت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ وہ عربی فارسی کے خارجی الفاظ فقروں اور ضرب المثلوں کے ساتھ ہندی اور بھاشا کے نرم میٹھے اور رسیلے شبدوں سے کام لیتے تھے۔ حالی کا مقصد عبارت آرائی نہیں تھا بلکہ وہ مطالب اور نکات کو آسان طریقے سے ذہن نشین کرنا چاہتے چناں چہ اس کامیابی کے ساتھ بعض اوقات ان کو منشیانہ لہجہ اختیار کرنا پڑتا جو پھیکا اور بے مزہ ہوتا۔ بعض اوقات ادق اور بھونڈے انگریزی کے الفاظ بھی جیسے لبرل Liberal، لایف Life، ٹائم سرور Time Server اردو مخمل میں ٹاٹ کے پیوند معلوم ہوتے لیکن ان مثبت اور منفی پہلوؤں کے باوجود بیسویں صدی میں جس طرزِ بیان اور اُسلوب و نگارش کی سب سے زیادہ تقلید کی گئی وہ حالی کی طرزِ بیان ہے۔ حالی کی سوانح نگاری میں ان کی تینوں کتابیں شاہکار ہیں جس میں **حیاتِ سعدی**، **یادگار غالب** اور **حیاتِ جاوید** شامل ہیں۔

سب سے مشہور اور مقبول نثری دستاویز مقدمہ شعر و شاعری ہے جو سوا سو سال گزرنے کے بعد بھی سب سے اہم تنقیدی مقالہ تصور کیا جاتا ہے۔ مقدمہ اردو تنقید کا ایک ایسا باقاعدہ علمی رسالہ ہے جس میں شعر و ادب کی ماہیت ساخت تاثیر افادیت اور اس کی اصلاحی اور تعلیمی اقدار پر بحث کر کے نتائج فراہم کیے گئے ہیں جو اُردو ادب کے لیے صحت مند ثابت ہوئے۔

الف۔ شاعری صرف تفریح نہیں بلکہ تعمیری قدروں کے لیے بھی کار آمد ہے۔

ب۔ فرضی خیالات کی جگہ اصلیت اور جوش کو جگہ دی جائے۔

ج۔ ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے ہدف یعنی اس میں مقصدیت ہو۔

د۔ اُردو کے دامن کو مغربی مما لک کے لٹریچر سے روشناس کر کے اس کو وسعت دی جائے۔

ھ۔ شاعری سے اخلاق سازی اور انسان سازی کا کام لیا جا سکتا ہے۔

و۔ اُردو ادب کے افادی پہلو کو پیش کیا گیا۔

ز اردو میں شاعری میں تصنع اور غیر ضروری صنعتوں سے گریز کی تاکید کی گئی ہے۔

ح۔ اُردو شاعری کی اہم اصناف پر جدا جدا تفصیلی ریویو کر کے ان کی اصلاح کے پہلو دکھائے گئے ہیں۔

مقدمے میں ایسے کئی مسائل ہیں جن سے اختلاف ہوسکتا ہے۔مغربی ترازو پر اُردو شاعری کا تولنا ہمیشہ ٹھیک نہیں دونوں زبانوں کے مزاج اور ماحول جدا جدا ہیں۔ اُردو اصناف پر ریویو کرتے ہوئے صرف منفی اثرات مثالوں سے واضح کیے گئے ہیں جب کہ ضرورت یہ تھی سکہ کا دوسرا رخ مثبت روشن حصہ بھی دکھاتے۔ پروفیسر سید مسعود حسن ادیب نے ہماری شاعری میں بہت عمدہ اور سچا سوال اٹھایا ہے کہ اُردو شاعری میں سب کچھ خس و خاشاک نہیں بلکہ اس گلشن میں بہت کچھ گل و بہار کا اثاثہ بھی موجود ہے جس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ادیب ہماری شاعری میں کہتے ہیں:

> حالی کا مقدمہ اور مسدس دونوں سے صاف ظاہر ہے کہ شعر و شاعری کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر اخلاقی ہے۔ پیش نظر کتاب کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اس کے مصنف کا نقطۂ نظر ادبی ہے۔ لیکن حالی کا یہاں سے اختلاف کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ جو کچھ انھوں نے چھوڑ دیا تھا اُسے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی ہماری شاعری خواجہ حالی کی شعر و شاعری کا جواب نہیں، اُس کا تتمہ ہے۔ حالی نے تصویر کا ایک رخ دکھایا تھا۔ اس کتاب میں اس کا دوسرا رُخ پیش کیا گیا ہے۔ جو لوگ ان دونوں کتابوں کا غور سے مطالعہ کریں گے وہ اُردو شاعری کے دونوں رُخ دیکھ کر صحیح رائے قائم کرسکیں گے۔ (۳۲)

یہ مشہور ہے کہ حالی کی نثر سیدھی سادی سلیس مگر بعض مقامات پر یکسانیت اور منشیانہ لہجہ سے استفادہ کی وجہ سے خشک اور سپاٹ بھی ہو جاتی ہے۔ بقول آل احمد سرور محمد حسین کی صناعی، نذیر احمد کا زورِ بیان اور شبلی کی رنگینی سب اپنی اپنی جگہ خوب ہیں مگر آج ان لوگوں کا اثر بہت کم ہوگیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ حالی کا طرز ہی پایندہ طرز تھا جسے اُردو کے ادیب اپنا سکے اور ایسے ہی طرز کو حیاتِ جاوید عطا ہوئی۔

پروفیسر گریہم بیلی کہتے ہیں کہ حالی کے طرزِ نگارش اور اسلوب بیان میں مصنوعی آرایش اور تصنع نہیں وہ کسی قدر پھیکا ضرور ہے لیکن زور اور صحت سے معمور ہے۔ (۳۳)

شیخ چاند نے حالی کی نثر کو سنجیدہ جچی تلی اور متین بتایا ہے۔ حالی خیال کے اعتبار سے زبان و بیان اختیار کرتے ہیں اور موثر و دل نشین انداز میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرتے ہیں۔ ایڈیٹر زمانہ منشی دیانرائن نگم کہتے ہیں۔ اردو میں سب سے پہلے حالی نے نئے طرز کی سوانح عمریاں لکھیں۔ اُردو کے ادیبوں انشاپردازوں اور ناقدوں کی مشترکہ ارائے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو نثر کا سکہ رائج الوقت حالی کا طرز بیان ٹھہرا جو کچھ کچھ تبدیلی سے آج بھی جاری و ساری ہے۔ میر انیس نے اپنی نظم کے بارے میں کہا تھا:

ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

حالی کی نثر کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جس رنگ کا مضمون ہوتا اُسی رنگ کے الفاظ سے باندھتے۔ اگر خوشی اور شادی کا مضمون ہوتو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ شہنائی بجا رہے ہیں۔نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔ زربافت لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اگر غم درد وحزن کا مضمون ہوتو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ آنسو بہا رہے ہیں اور افسردہ اور رنجیدہ ہیں۔ اگر حیرت اور استعجاب کا متن ہوتو ایسا لگتا جیسے الفاظ منہ کھولے بال بکھرائے ہوئے محو حیرت اور سرگرداں ہیں۔حقیقت یہی ہے کہ شاعرانہ نثر کے معنی یہی ہیں۔

حالی اپنی نثر میں غیر مانوس اورثقیل الفاظ استعمال کر کے اپنے علم وفضل کا پرچار نہیں کرتے اور نہ مضمون کو مشکل اور خارج ازفہم بلکہ سلیس نرم دلکش سیدھے سادے الفاظ ایسے انتخاب کرتے ہیں جو خیال کے جسم پر موزوں اور چست ہوں جس سے وہ جلوے سب کے سامنے پیش ہو جائیں جو بحیثیت ایک تخلیق کار ان کے تخیل اور ذہن میں ہوں۔ حالی کے اس عمل سے انشا اور بیان کی خوبیاں ضایع نہیں ہوتی۔

غدر سے کچھ پہلے غالب اور انیسویں صدی کے ربع آخر میں سرسید آزاد، نذیراحمد، حالی اورشبلی نے اپنے اپنے نثری دبستان کھولے جس کے نصاب میں ایک خاص طرزِ نگارش تھا۔سوائے نذیراحمد کے یہ سب شاعر تھے۔ نذیراحمد بھی کچھ اشعار موزوں کر کے اپنی تقریر سے پہلے ایک پھسپھی سی نظم پڑھتے جس سے لوگ بور ہوتے تو کہتے:

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد! — کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اورنعمانی

حالی نے مغربی طرز کی سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔انھوں نے تین کتابیں حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اورحیاتِ جاوید لکھی۔

حیاتِ جاوید پر ان کو ہندوستان کا باسول Boswell کہا گیا۔ حالی کی تصانیف میں بھی سعدی کی طرح سادگی تھی۔

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تم

واکر Waker وکٹورین لٹریچر میں لکھتا ہے:

> کسی بڑے شخص کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو بڑائی اور عظمت کا خود بھی حامل ہو۔

حالی نے غالب کی اس پیشین گوئی کو صحیح کر دکھایا:

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

یادگارِ غالب، غالب کی صحیح فہمی ہے یہ کتاب افراط اورتفریط سے خالی ہے جیسا کہ ڈاکٹر عبداللطیف کی منفی اور بجنوری کی مثبت میں غلو کا اندیشہ ہے۔کیا یہ زبان سپاٹ اور پھیکی ہے یا ارسال و ابلاغ کا حق ادا کر رہی ہے۔ حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں حالی لکھتے ہیں:

> ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے، جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے،تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علما ومفسرین کو للتاڑا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے،قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں، جس

کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق کا خطاب دیا ہے اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے، تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے، ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے ضروری ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔ (۳۴)

غالب فہمی کے ایک سرے پر عبدالرحمان بجنوری کا آفاقی جملہ۔ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ وید مقدس اور دیوانِ غالب دوسری طرف ڈاکٹر عبداللطیف کی منفی سوانح کہ غالب بڑے شاعر اور بڑے لوگوں میں شمار بھی نہیں کیے جا سکے حالی کی یادگار غالب دراصل صحیح غالب کی شخصیت اور فن پر کھینچی گئی تصویر ہے لیکن غلام مہر رسول لکھتے ہیں:

یادگارِ غالب اپنی تمام خوبیوں کے باوجود غالب کی صحیح، مفصل اور مستند سرگزشت حیات نہیں ہے۔

غالب کی زندگی کے حالات کی تحقیق وفراہمی کے لیے خواجہ حالی کو جو مواقع حاصل تھے، وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے، خواجہ مرحوم غالب کے عزیز شاگرد تھے، تمام شاگردوں میں علم وفضل کے اعتبار سے افضل تھے، غالب کے نہایت ہی عزیز اور دیرینہ دوست نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے رفیق تھے، اکثر غالب سے ملتے رہتے تھے اور ان کے تمام حالات پوچھتے اور سنتے رہے ہوں گے، انھوں نے غالب کی زندگی میں ان کی تمام تصانیف پڑھ لی ہوگی اور جو تحریرات غالب کی زندگی کے واقعات و حالات کا مرقع تھیں، ان کے غیر واضح یا کم واضح حصول کو خود غالب سے واضح کرا لیا ہو گیا یا واضح کرا لینا چاہیے تھا، لیکن افسوس کہ یادگار ان توقعات کو پورا نہیں کرتی جو حالی اور غالب کے گہرے تعلقات کی بنا پر اس کتاب سے وابستہ کی جا سکتی ہیں، اگر شاعر اور ادیب کے سوانح حیات کی ترتیب کا حقیقی مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی تصانیف کے فہم میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے، اس ماحول کے متعلق زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل ہو جائے جس میں صاحب سوانح نے زندگی گزاری جس کی آغوش میں اس کے خیالات و افکار نے قالب حیات اختیار کیا اور نشو ونما پا کر حروف و الفاظ کا لباس پہنا تو میری ناچیز رائے میں یادگار کی بلندی پایہ کے اعتراف کے باوجود کہنا چاہیے کہ وہ اس مدعا کی تکمیل کا مرقع نہیں بن سکتی۔ غالب کی تصانیف کے مطالعہ کے دوران میں جا بجا سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب کے لیے مشتاق نگاہیں یادگار کے صفحات کی طرف بے اختیار اٹھتی ہیں تو زیادہ تر ناکام واپس لوٹتی ہیں۔

حالی نے کم وبیش اٹھارہ کتابیں نثر میں اور چھوٹی بڑی سینتیس (۳۷) کتابیں نظم میں لکھی ہیں اور اس کے علاوہ نامکمل مسودات کا ذخیرہ بھی چھوڑا ہے۔ مولانا کی نثر میں کل حسب ذیل کتابیں ہیں:

تاریخ محمدی، پر منصفانہ رائے، طبقات الارض، شواہد الالہام، اصول فارسی، سوانح عمری حکیم

ناصر، مجالس النساء، دو حصے مولود شریف، حیاتِ سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، مقالات، مضامین، مکتوبات وغیرہ۔

سچ تو یہ ہے کہ ہماری زبان اور ہماری شاعری مولانا کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی، بقول ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب:

> حالی بہت بڑے شاعر اور نقاد تھے اور کچھ اس سے بھی بڑھ کر تھے، وہ اپنے زمانہ کے ادبی مجدد تھے، جنھوں نے ملک کے بگڑے ہوئے مزاج کو سدھارا اور سنوارا اور اردو ادب کو پستی سے نکال کر بلندی کی راہ دکھائی۔
>
> حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں پختگی و سادگی کی وہی آن رکھتی ہے، جو ان کی نظم میں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عبارت کی سلاست اور روانی کے ساتھ معانی کی صحت اور لہجہ کی متنات کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ علمی مسائل اور ادبی نکات کو صاف اور سلجھے ہوئے فقروں میں اس طرح لکھنا کہ ہلکا پن نہ پیدا ہونے پائے اگر کسی کو آتا ہو، تو اس نے حالی ہی سے سیکھا ہوگا۔ (۳۵)

یہ سچ ہے کہ مولانا حالی کی چند نثری کتابیں مذہب پر بھی ہیں جس کی زبان بہت سادہ اور ابتدائی زمانے کی ہے۔ وہ حالی سے زیادہ ایک مولوی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ حالی کی سب سے مشہور تصنیف مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ جو تنقید نگاری کی سنگ بنیاد ہے۔ آج سو سال سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ بعض معتبر افراد کا خیال ہے کہ اُردو ہی میں نہیں بلکہ عربی اور فارسی میں ایسی عمدہ کتاب کا وجود نہیں۔ شیخ چاند کہتے ہیں:

> یہ فن شعر پر ایسی بلند پایہ اور حکیمانہ تنقید ہے کہ اسلامی ادبیات میں نہ تو اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ آج تک کسی کو لکھنے کی ہمت ہوئی۔ (۳۶)

ع میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

حالی کی جھڑپ شیخ واعظ اور مفتی کے ساتھ:

شاید ہی اردو کا کوئی ممتاز شاعر ہو جس نے شیخ واعظ اور مفتی کی ریاکاری پر طنز نہ کیا ہو۔ حالی کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس موضوع کو خاص طنز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ حالی کے کلام میں درجنوں اشعار ان نام نہاد تفرقہ انداز دین و مذہب کے ظاہری اجارہ داروں کے قول اور عمل پر ملتے ہیں۔ حالی جس ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے جہاں مسلمان ذہنی، تعلیمی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی طور پر پسماندگی سے دو چار تھے اور جو افراد قوم کو سدھارنے، جگانے اور بنانے میں اپنے دن رات صرف کر رہے تھے ان پر شیخ، زاہد، واعظ اور مفتی کے جارہانہ حملے ہو رہے تھے تاکہ عوام کی نظر میں ان رفارمروں کی شخصیت کو مسخ اور خراب کر کے پیش کیا جائے جس کا علمی ثبوت مختلف اخباروں پرچوں رسالوں اور خطبوں میں ان قومی افراد کے خلاف تحریروں اور

تقریروں کا ایک مسلسل محاذ قائم کیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان افراد کو اسلام سے باہر کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔

چناں چہ سرسید، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور آگے چل کر علامہ اقبال پر بھی کفر کے فتوے دیے گئے۔ حالی ان حالات سے بہت رنجیدہ تھے۔ حالی نے کئی شعر اپنی غزلوں، قطعوں، نظموں اور رباعیوں میں اپنے خاص تعارف اور حق بیانی پر کہے ہیں۔ کیوں کہ ان تمام اشعار کی تشریح اور تفسیر کے لیے ایک پورا دفتر چاہیے۔ اس لیے اس مختصر اور محدود تحریر میں ہم اشعار کو گلستان شعر سے گلچین کر کے گلدستہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں جس سے حالی کی گلشنِ فکر کے رنگ و بو کا احساس ہوسکتا ہے۔ پہلے یہاں ہم حالی کا تعارف اور ان کا رجحان جس کا تعلق ہمارے اس موضوع سے بلواسطہ یا بلاواسطہ ہے پیش کر رہے ہیں پھر اس کے بعد مختصر مگر جامع طور پر ان شعروں کو درج کیا جائے گا جو بآواز بلند نعرہ لگا رہے ہیں کہ

برہنہ حرف بگفتن ہنر گویائیت

گر نہیں سنتے قول حالی کا پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا نہ تھا
ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے کچھ رنگ یہاں حالی ہے سب سے جدا تیرا
جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالی کچھ کر کے بھی دکھائے زور قلم تمھارا
گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ
متاع بے بہا ہے شعر حالی مری قیمت مری گفتار سے پوچھ
مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ
تم نے حالی کھول کر ناحق زباں کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ
قصے میں اہل دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا
نہ ہم رہیں گے نہ حالی یہ دل خراشی جہاں رہے گی حالی دل گیر کی صدا اک ایک

حالی نے مقصدی شاعری کی ہے۔ وہ اتحاد اور اتفاق کے علم بردار ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں:

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر اسلام ہے فقیہو ممنوں بہت تمھارا

اسی موضوع پر دو طنزیہ رباعیاں دیکھیے:

رباعی:

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخواں پکا ہوتا نہیں مومن کا اب ایمان پکا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکا

رباعی:

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دین سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقین

مومن سے ضرور ہوگا یہ مرقد میں سوال — تکفیر بھی کی فقہا نے کہ نہیں
کرتے ہیں اک اک کی تکفیر آپ کیوں — اس پہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ

ایک قطعہ کے آخری شعر میں حالی کے سوختہ دل کی آواز سنیے۔ اہل وعقد ہیں۔ اب متفق اس رائے پر = سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے کبھی جو اس کا نام بدنام کر رہے ہیں۔ ان سے یوں مخاطب ہیں:

منہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نام اسلام — بارود بجھ رہی تھی گویا لب و دہن میں
ادبار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اسلام — اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا

حالی کے کلام میں جا بجا خود نما مذہبی رہنماؤں کے اخلاق و اطوار اور ان کے کردار اور رفتار پر تلخ اور سچے اشعار ملتے ہیں۔ حالی کے پاس پوری پوری غزلیں اے شیخ! اے واعظ! اور زاہد کے نام ہیں:

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد — تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد
میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تم سے — تو ہی کہہ اس میں ہے کیا، مری خطا اے زاہد
عیب حالی کے بہت آج کیے تو نے بیاں — ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاہد
ریا کو صدق سے ہے جامِ مئے بدل دیتا — تمھیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ
غرور فقر غرور غنا میں فرق ہے کیا — تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ
کمالِ حسن عقیدت دے آیا تھا حالی — یہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

حالی نے مشکل اور ادق ردیف اور قوافی میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ چند شعروں میں زاہد اور واعظ پر نکتہ چینی کی ہے۔ جیسے اس غزل میں قوافی آڑ، لتاڑ اور بگاڑ وغیرہ۔

کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار — پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ
بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی — اِن دنوں کم تر ہے کچھ ہم پر لتاڑ
یہ ہیں واعظ سب پہ منہ آتے ہیں آپ — ناصح قوم اس پہ کہلاتے ہیں آپ
واعظو! دین کا خدا حافظ — انبیا کے ہو تم اگر وارث
شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاک باز — سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث
اک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے — اے زاہدو! تمھارا ہے اس میں کیا اجارا
عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم — ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا
مان لیجیے شیخ جو دعویٰ کرے — اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا
جو کریں گے بھریں گے خود واعظ — تم کو میری خطا سے کیا مطلب

شیخ اللہ رے تیری عیاری — کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز
اک پتے کی جو ہم نے کہہ دی بات — رنگ واعظ کا کر گیا پرواز

تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط
زاہدو! ہم تو تھے ہی آلودہ تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف
کیوں فقیہوں سے رک گئے حالی بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف
ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن یہ جبّہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ
سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر نہ ستار ہے تو نہ غفار واعظ
صحبتیں اہل ورع کی سب گئیں نظروں سے گر بزم رنداں میں یونہی اک روز جا بیٹھے تھے ہم
شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی ورنہ دھوکہ دور سے دیکھ اس کو کھا بیٹھے تھے ہم
ہم نہ تھے آگاہ زاہد زشت خودی سے تری آدمی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم
ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونو دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے
اڑے گ خاک تدس کی اب سر بازار فقیہہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے
رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی بنائی بہت بات پر بن نہ آئی
برائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن کہاں یہ برائی کہاں وہ برائی
شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا آ کے مسجد میں کیا لیا تو نے

حالی نے بعض غزلوں میں نامانوس خارجی ادق قافیے مصرف کیے ہیں اور صرف اعراض، اغماض، مقراض، مرتاض پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض مقامات پر پورا ایک مصرعہ یا پورا ایک شعر عربی زبان کا داخل غزل کر دیا:

وعظ میں گل کرتے ہیں واعظ منہ میں ان کے زباں ہے یا مقراض
ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد خارکش تجھ سے ہے سوا مرتاض
ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع ھل لنا فی نزاعنامن قاض
لا اُبالی بان یحاتیے کُل ناسِ وانت عنی راض

یعنی ہم میں اور فقہا میں جھگڑا ہے کیا ہمارے لیے اس جھگڑے کا کوئی فیصلہ کرنے والا ہے۔ میں اس بات کی پرا نہیں کرتا کہ ہر شخص مجھ سے ناراض ہے میں تو اس بات پر خوش ہوں کہ تو مجھ سے راضی ہے۔

حالی حق کی بات سادے لفظوں میں سنا دیتے ہیں:

کیجیے کیا حالی نہ کیجیے سادگی گر اختیار بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح
زینۂ منبر ہے لغزش کی جگہ جانیو واعظ اسے راہِ صراط
لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا
اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی کہتے پہلے سے تو دے لے کے ہٹایا جاتا
جن کے معبود حور و غلماں ہیں ان کو زاہد خدا سے کیا مطلب

نسل جوان اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں حالی کا حصہ:

حالی کا وہ کلام جو بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہے اور جو نسل جوان سے خطاب کے زمرے میں شمار ہو سکتا ہے۔عوام اور خواص سے بیگانہ رہا اور اُردو کے پرستاروں اور تنقید نگارون نے حسن یوسف کو بازارِ مصر میں پیش نہیں کیا۔ حالی نے جدید نسل کی ذہنی تربیت کی ہے آج ہم حالی کی بدولت جھوٹی شان سے دور ہیں چناں چہ جب ہم گھر کے باغ میں پودوں کو سنوارتے ہیں تو ہم مالی بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی موچی کبھی باورچی کبھی بڑھئی کبھی ڈرائیور بن کر اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس ذہنی انقلاب میں حالی دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ہماری ذیل کی گفتگو حالی شناسی کی وہ جہت ہے جس پر تحقیقی اور تجلیلی کام شایانِ شان انجام نہ ہوا تھا۔

علم و ہنر، اخلاق و کردار، تعلیم و تربیت کی نشو و نما بچپن سے کی جاتی ہے اسی لیے مہذب خاندانوں تعلیم یافتہ گھرانوں میں بچوں کے لیے اتالیق رکھتے جاتے جو ہر قدم پر موقع و محل کے حساب سے بچوں کی تہذیب کی پرورش کرتے تھے۔شعر و ادب بھی ایک ایسی آموزش گاہ ہے جس میں شاعر اور ادیب استاد معنوی تصور کیے جاتے جو تحریروں اور تقریروں کے ذریعے بچوں کا ادب تشکیل دے کر ان کی تفریح کے سامان کے ساتھ تعمیری فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

ادب برائے ہدف شاعری برائے زندگی جسے مقصد ادب و شاعری بھی ہیں اُس کا ایک اہم جز و انسان سازی بھی ہے جو مہد سے لحد تک جاری رہتی ہے۔ چناں چہ اس تربیت میں بچوں اور نسل جوان کے ادب کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُردو شعر و ادب میں دوسری زبانوں کے مقابل بچوں کے ادب پر کم کام ہوا ہے جس پر ہم آگے روشنی ڈالیں گے لیکن پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون کون سے لوازمات اور نکات وخصوصیات ہیں جو بچوں کے ادب کے لیے ضروری ہیں۔ بچوں کے ادب کی زبان سیدھی سادی، سلیس و شگفتہ اور پیچیدہ تشبیہات اور استعارات سے پاک ہونی چاہیے۔ ایسی صنعتیں بھی نہ ہوں جس سے سمجھنے میں دقت پیش آئے۔ ان کے علاوہ اگر ادب میں بچگانہ پن یا بچپن نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں بچوں کا ادب نہیں کہلا سکتا۔یعنی شعر و ادب میں موضوع کا انتخاب بچوں کے سن و سال سے ہم آہنگ ہو اور پھر طرزِ بیان کچھ ایسا ہو جو بچوں کی نفسیات اور جذبات سے میل کھاتا ہو جس کی وجہ سے بچوں کا کامیاب ادیب و شاعر خود اس تخلیق کے وقت بچہ بن جاتا ہے۔ ایسے اشعار کو کم درجے کے بے روح اور سبک سستے شعر نہیں کہنا چاہیے یہ وہ اشعار ہیں جو بچپن سے بڑھاپے تک ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔بعض اوقات اشعار اگر چہ بہت آسان اور عام فہم بھی بچوں اور نسل جوان کی عمروں کے مطابق نہ ہو لیکن بچوں کو یاد ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے بچپن کی یادداشت بن جاتے ہیں جس کی وجہ آسان شعروں کا بچوں کی فکر اور جذبات سے یکساں ہونا ہوتا ہے۔ جیسے علامہ محمد اقبال کا یہ شعر:

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری　　　زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اس شعر کے مقابلے میں جہاں بچگانہ پن ہر لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ شعر اسماعیل میرٹھی کا ہے:

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی (۳۷)

جہاں تک اُردو شعر و ادب میں بچوں کے ادب کا تعلق ہے اس کی کمی کی وجوہات میں اُردو کی کم عمری بچپن کی کوتاہ مدت اور اُردو کے بچپن میں اس کا زیادہ تر بڑوں کے ساتھ ملاپ شامل ہے۔ بچوں کی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کے ادب کی پذیرائی بھی ویسے نہیں ہوئی جس طرح ہونی تھی۔ چناں چہ بچوں کے ادب کے ادیب و شاعر بھی کچھ دن کے بعد ہمیشہ کے لیے بڑوں کے ادب کے ہو کر ہو گئے۔ بعض عمدہ شاعروں اور ادیبوں نے یہ روشنی ہمیشہ جاری رکھی جن میں نظیرا کبر آبادی، میرامن، اسماعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی، اقبال، حفیظ جالندھری، راشد الخیری، امتیاز علی تاج اور کوئی چھوڑے بڑے جدید شاعروں اور ادیبوں کے نام اور کام شامل ہیں۔

نظیرا کبر آبادی کی شاعری کے وہ حصے جس میں تماشا کھیل طنز و مزاح سادگی کے ساتھ ملتا ہے بچوں کی توجہ کا باعث رہا۔ بچوں کی خاص نظمیں ''ہنس'، ریچھ کا بچہ ان کے تماشے کی یاد تازہ کر دیتا تھا۔ میرامن کے پاس کہانی کا جو تجسس اور شیریں بیانی تھی وہ بچوں اور نسل جدید کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ محمد حسین آزاد حقیقت میں استاد تھے ان کی نظموں اور نثر کی کتابوں میں وہ سب چیزیں تھیں جنھیں شاگردوں کے لیے لکھا تھا۔ آزاد کی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں ''قصص ہند'' اور ''نصیحت کا کرن پھول'' اُس دور میں پسند کی گئی تھیں۔ اسماعیل میرٹھی سب سے مشہور بچوں کے شاعر گزرے ہیں ان کی نظموں کو جو بچپن سے لبریز ہیں اور سادگی میں تازہ مضامین کی پیش کش ہے ایک کامیاب شاعر میں ڈھال دیتی ہے۔ علامہ محمد اقبال نے فارسی میں بچوں اور نسل جواں جاوید سے خطاب وغیرہ لکھا اور اُردو میں بھی ان کا کلام بچوں کے لیے کم مگر پر تاثیر ہے۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار بچوں کو یاد ہیں ایک مصرعہ پڑھیے دوسرا وہ اٹھا لیتے ہیں۔ حالی نے ایک معلم کی حیثیت سے اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ گزارا وہ بچوں اور نسل جواں کی نفسیات جذبات اور ضروریات سے واقف تھے۔ وہ تہذیب وتمدن کی امانت نئی نسل کو سپرد کرنے سے پہلے انھیں اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ وہ قومی قدروں کو اضافوں کے ساتھ اپنی آیندہ نسلوں کو پیش کر سکیں۔ حالی نے اگر چہ نثر میں کوئی علیحدہ کتاب نہیں لکھی مگر مجالس النساء میں بچوں کے لیے کارآمد باتیں کیں جن سے عورتیں اور ان کی آغوش کے پلے بچے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ حالی کی شاعری خصوصی طور پر ان کی نظمیں اور مسدس سے بچے جوان بڑھے سب اپنی اپنی فکر اور علمی استطاعت کے مطابق استفادہ کر رہے تھے۔ اسی لیے ان کی نظموں اور مسدس کے بند کو درسی کتابوں میں جگہ دی گئی تھی۔ اگر چہ ان شعروں کا مقصد اخلاق سازی اور قوم سازی تھا اور اس میں بچپن کا چلبلا پن اور معصومیت نہیں تھی۔ اس لیے ہم ان اشعار کو نسل جدید کی تعمیر و تربیت کے شعر تو کہہ سکے ہیں لیکن انھیں مکمل طور پر بچوں کے ادب میں جگہ نہیں دے سکتے۔ بچوں کے ادب کے متعلق ناقدوں نے انہی اشعار کو مورد بحث وتنقید کیا کیوں کہ وہ حالی کی اُن بچوں کی نظموں سے واقف نہیں تھے جنھیں حالی نے محکمہ تعلیم کے تقاضے اور فرمایشات پر لکھی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب ٹریننگ کالج لاہور کے پرنسپل نولٹن کی زیرنگرانی بچوں کی نظموں کا مجموعہ **اطوار بازیچہ** شایع ہو چکا تھا اور بچوں کے متعلق نظمیں **بچوں کا اخبار** میں بھی شایع ہوئی تھیں۔

یہاں ہم پہلے حالی کی اُن مخصوص نظموں پر بات چیت کریں گے جو خاص بچوں کے لیے لکھی گئیں ہیں۔ اوپر دیے گئے چودہ نظموں کے تقریباً پونے چار سو شعروں میں ایک شعر بھی مشکل سے ایسا نہیں نکلے گا جو کم عمر بچہ کی سمجھ سے باہر ہوگا۔ خدا کی شان کے عنوان سے اس چھوٹی سی سترہ (۱۷) اشعار کی مثنوی میں خدا کی معرفت، خدا کی محبت، خدا کی نعمتیں، خدا کی رحمتیں ان مثالوں اور حالات سے بیان کی گئی ہیں جس سے بچہ واقف ہے۔ اسے تک بندی نہیں بلکہ بچوں کی شاعری سمجھنا چاہیے اور اس کی لذت سے آشنا ہونے کے لیے ناقد کو بچہ بننا ضروری ہے:

تو ہی ہے سب کا پالنے والا　　　کام سب کا نکالنے والا

مغربی دنیا میں چھوٹے بچوں کے مکتب اور مدرسوں کو کنڈر گارڈن کہتے ہیں۔ وہاں سب سے پہلے بچے کو اُس کے اعضا اور ان کے کاموں سے روشناس کیا جاتا ہے۔ حالی نے اس کام کے ساتھ بچے کے ذہن میں ہر نعمت کے والی اور ہر مشکل کے حل کرنے والے کے ساتھ ایک ابدی رشتہ بھی پیدا کیا ہے:

آنکھ دی تو نے دیکھنے کے لیے　　　کام کرنے کو ہاتھ پاؤں دیے
بات کے سننے کو دیے دو کان　　　بات کہنے کو تو نے بخشی زبان

بھوک پیاس گرمی سردی جاڑ ابر سات سب کا یہاں ذکر کر کے اس کا ربط خدا سے کر دیا کہ جب لوگ ان سے تنگ آ جاتے ہیں تو صرف خدا ہی ان سے نجات دلاتا ہے:

کیں سدا تو نے مشکلیں آساں　　　تیری مشکل کشائی کے قرباں

ایک ہلکی پھلکی لیکن موسیقی سے بھرپور نظم جو مربع کی شکل میں ہے اور کورس کے طور پر مل کر پڑھی جا سکتی ہے۔ اخلاق کا سبق ہے:

چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو　　　سر پر بڑوں کا سایہ، سایہ خدا کا جانو
وہ کام مت کرو تم جس کام سے وہ روکیں　　　اُس بات سے بچو تم جس بات پر وہ ٹوکیں
تم کو نہیں خبر کچھ اپنے برے بھلے کی　　　جتنی ہے عمر ہے چھوٹی اتنی ہے عقل چھوٹی
سیکھو گے علم و حکمت ان کی ہدایتوں سے　　　پاؤ گے مال و دولت ان کی نصیحتوں سے

یوں نظم نصیحت سے سجی ہے لیکن نصیحت آمیز کچھ مبالغہ مصرعوں کے باوجود دل کو چھونے والی ہے۔ ابتدائی مکتب کے بچوں کے لیے اچھا ترانہ ہے۔ حالی نے بچوں کے لیے چھوٹی بڑی چودہ نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں حالی کی زندگی کے آخری دور کی نشانیاں ہیں۔ حالی نے ان نظموں کے لیے مربع، مخمس، مسدس اور مثنوی کی ہیئت استعمال کی۔ حالی کی ان نظموں کا زمانۂ تصنیف ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۸ء بتایا گیا ہے۔

جدول

	عنوان	ہیئت	تعدادِ شعر
۱۔	خدا کی شان	مثنوی	۱۷ شعر

۲۰۔	بڑوں کا حکم مانو	مربع	۱۸شعر
۳۰۔	مرغی اور اس کے بچے	مثنوی	۱۴شعر
۴۰۔	بلی اور چوہا	قطعہ	۶ شعر
۵۰۔	شیر کا شکار	مسدس	۱۵شعر
۶۰۔	پیشے	مثنوی	۸۴شعر
۷۰۔	گھڑیاں اور گھنٹے	مسدس	۲۴شعر
۸۰۔	دھان بونا	مثنوی	۹شعر
۹۰۔	روٹی کیوں کر میسر آتی ہے	مثنوی	۸۷شعر
۱۰۰۔	موچی	مخمس	۱۲شعر
۱۱۰۔	چٹھی رساں	قطعہ	۲۲شعر
۱۲۰۔	سپاہی	مثنوی	۸شعر
۱۳۰۔	ایک چھوٹی بچی کے خصائل	مثنوی	۳۹شعر
۱۴۰۔	نیک بنو نیکی پھیلاؤ	مسدس	۲۱شعر (۳۸)

ان نظموں کا ماخذ جواہرات حالی ہے صرف آخری نظم مجموعہ نظم بچوں کا اخبار لاہور سے لی گئی ہے۔ حالی کی نظموں کی یہ تعداد صحیح نہیں بلکہ اگر تلاش اور تحقیق کی جائے تو مزید نظموں کے ملنے کا امکان ہے۔ سب سے بڑی نظم مثنوی **پیشے** کے عنوان سے لکھی اور سب سے چھوٹی نظم قطعہ **بلی اور چوہا** چھے شعر کا لکھا۔ حالی کی ان نظموں میں بیانیہ انداز ہلکے پھلکے مگر دلچسپ موضوعات تفریحی اور معلوماتی اشعار جو آسانی سے بچوں کو یاد ہو جائیں نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں حالی نے بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے پڑھنے والے کو بچہ بن کر پڑھنا پڑے گا ورنہ اس کے لطف و مزے سے فائدہ اٹھا نہیں سکے گا۔ حالی نے کسی حد تک بچوں کی نظموں میں اسماعیل میرٹھی کی نظموں کی تقلید کی ہے۔ اگرچہ وہ اُس سطح تک پہنچ نہ سکے اسماعیل میرٹھی نے ۱۸۹۳ء میں اپنی بچوں کی نظموں سے زینت دے کر ابتدائی کلاسوں کے لیے ایک درسی کتابوں کا سلسلہ جاری کیا تھا جو محکمہ تعلیم کو ترغیبات کا نتیجہ بھی تھا۔ ان درسی کتابوں میں شامل بچوں کی نظمیں بہت مقبول ہوئیں اور کئی لوگ اُس دور میں اس میں دلچسپی لینے لگے۔

مرغی اور اس کے بچے کی مثنوی میں لاشعوری طور پر بچے اور ماں کی رشتے کو مضبوط کیا گیا ہے کہ بچے ماں کے ساتھ رہیں ماں کا کہنا سنیں اور یہ ممتا کی محبت ہی ہے جو حیوانوں اور انسانوں میں زندگی کا رنگ بھرتی ہے اور اس ممتا سے کئی گنا زیادہ خدا کی محبت ہے جو بندوں کی حفاظت اور ہدایت کرتا ہے۔ اس نظم میں بچے جو سنتے ہیں جو دیکھتے اس کو نظم کیا گیا ہے:

یہ جو ہے گھر میں تمھارے مرغا   چیختا زور سے ہے ککڑوں کوں
دن نکلتے ہی ادھر مرغی بھی   فوج بچوں کی لیے نکلے گی
ٹکڑے روٹی کے ہوں یا ہو دانہ   چونچ سے دے گی وہ منہ میں ان کے
مرغی جس طرح کہ ان بچوں کی   کرتی ہے شام و سحر رکھوالی
بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا   ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

حالی کی ان نظموں میں ہندوستانی اور ہندی کے الفاظ حسب ضرورت مصرعوں میں خوبصورت طریقے سے جڑ دیے گئے ہیں۔ ان نظموں میں شاید ہی کوئی ترکیب اضافت تلمیح یا ادق خارجی لفظ ہو۔ محاورے وہ بھی روز مرہ میں جو بچوں کی علمی اور فکری معیار سے نسبت رکھتے ہوں۔ نظم میں خوب صورتی اور تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ حالی کی شاعری میں ترقی پسندی کا عنصر یہاں کھل کر سامنے آتا ہے جہاں ہر کام کی قدر اور اس کی عزت کی گئی ہے۔ کوئی بھی معمولی یا جاگیردارانہ لہجہ میں ادنیٰ پیشہ حقیقت میں ادنیٰ نہیں ہوتا اور اُس پیشہ کو عمدگی سے کرنے والا کسی دوسرے اعلیٰ پیشے سے کم نہیں ہوتا۔ حالی قوم کی تربیت کر رہے تھے جہاں روسا حکمران اونچے خاندان کے افراد شاہی کے بجائے گدائی کر رہے تھے۔ روٹی کپڑا اور مکان کے محتاج ہو گئے تھے لیکن اُن پیشوں کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتے تھے جن میں محنت مشقت عرق ریزی کی ضرورت ہوتی تھی۔ قوم جل چکی تھی لیکن رسی کا بل ابھی باقی تھا جس کا اثر ان خاندان کے بچوں پر منفی پڑ رہا تھا ایسے حساس موقع پر حالی نے کئی بچوں کی نظمیں لکھ کر انھیں ترغیب دی کہ ہر پیشہ معتبر اور مقتدر ہے۔ ایک کاریگر جو جوتے بنانے میں ماہر ہے اس کی مہارت اور کاریگری کسی طرح سے یونان کے فلاسفر افلاطون کے فلسفہ کلام سے کم نہیں۔

حالی کی نظمیں پیشے، چٹھی رساں، موچی، سپاہی وغیرہ وہ نظمیں ہیں جن میں اوپر بیان کیے گئے مطالب کے ساتھ ساتھ اُن پیشوں کی معلومات اور اصطلاحوں سے بچوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔ حالی نے پیشہ کے عنوان سے مثنوی کی شکل میں چوراسی (۸۴) اشعار پر مشتمل بچوں کی طویل ترین نظم لکھی ہے۔ یہ نظم ماں اور بیٹوں کے درمیان بات چیت ہے۔ یہاں حالی نے سات بیٹوں کی گفتگو کو نظم کیا ہے جو اپنی ماں سے مخاطب ہو کر باری باری سے کہتے ہیں:

میں بڑا ہوں گا جب تو اماں جان   اپنے مقدور بھر بنوں گا کسان
میں جواں ہوں گا جب تو اماں جان   فوج میں جا کے ہوں گا میں بھرتی

آپ کے باغ کا بنوں مالی   کہ بڑا ہو کہ میں بنوں دھوبی
کنسٹبل بنوں گا اوّل بار   ہو سکا تو بنوں گا چٹھی رساں
اک بڑھئی مستری بنوں گا میں

ہمارے معاشرے میں کسان، دھوبی، سپاہی، ڈاکیا، کانسٹیبل، بڑھئی اور مالی بننا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صرف اعلیٰ ملازمتوں، انجینئروں، پروفیسروں اور تاجروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا جس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا

کہ لوگ بیکاری اور گدائی کے شکار ہوکر ذلیل وخوار ہوئے۔ حالی بچوں کے ذہنوں اور ان کی نفسیات سے واقف تھے۔ وہ یہ بیج بچپن کے زرخیز ذہن میں بور رہے تھے تا کہ جب وہ بڑے ہوں تو یہ صحیح فکر کا تناور درخت بن جائے۔ وہ ہر پیشہ کے کام وکاج کے ساتھ اس میں ترقی اور مہارت کے اپچ بھی بچہ کی زبان سے دوہرا رہے تھے:

کسان:

ہل چلاؤں گا بیج بوؤں گا　　وقت پر جب کہ غلہ کاٹوں گا
بھائی بہنوں کا حصہ باٹوں گا　　جو کماؤں گا گھر میں لاؤں گا

سپاہی:

سیکھ لوں میں کہیں قواعد جنگ　　مشق بندوق کے لگانے کی
جنگ کی ہے مہم سے کیا ڈرنا　　آدمی کو ہے ایک دن مرنا
کیا عجب ہے رسالہ دار بنوں　　اونچی ہو جائے گی تمھاری ناک
سب کہیں گے رسالہ دار کی ماں

مالی:

کیاریاں ہر طرح کی کھودوں گا　　نت نئے پھول میں اگاؤں گا
موتیا اور چنبیلی اور جوہی　　دیکھنا کیسے گل کھلاؤں گا

دھوبی:

اونچے کر کر کے دست و بازو میں　　کپڑے دھویا کروں چھوا چھو میں
اجلے براق صاف اور ستھرے　　برف شرمائے دیکھ کر جن کو
کھاؤں گا اور کھلاؤں گا اماں　　تم کو میں حق حلال کا لقما

کانسٹبل:

بدمعاشوں کو تنگ کر دوں گا　　جیل خانوں کو ان سے بھر دوں گا
جو کروں گا تو میں دل و جاں سے　　راست بازی سے اور ایماں سے

ڈاکیا:

لے کے سب چٹھیوں کا میں طومار　　بانٹ آیا کروں گا نام بنام
خط کسی کا نہ میں کروں گا تلف　　نہ بنوں گا ملامتوں کا ہدف

بڑھئی:

نہ بڑھئی وہ ہے جن کا نام بڑھئی　　جو کہ پھرتے ہیں کہتے کام بڑھئی

اس ہنر میں بنوں گا میں استاد　　اور کروں گا نئے نئے ایجاد
کارخانہ خود اک بنا لوں گا　　ہو گی جب ہر طرف مری شہرت
دیکھنا گاہکوں کی پھر کثرت　　مستری ایک ہو اگر ہشیار
ہر جگہ اس کے مشتری ہیں ہزار

حالی یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی کام گرا ہوا بے کار یا ذلیل نہیں ہوتا اگر ایک ظاہر طور پر معمولی کام ہو لیکن کاریگر اُسے کمال سے انجام دے تو اس کاریگر کی حیثیت کسی عظیم شخصیت سے کم نہیں۔ حالی معاشرے کی خامیوں کو خوبیوں سے بدل رہے تھے جس کا پھل ہم نے برصغیر میں دیکھا۔ اس موقع پر ہم ایک واقعہ جیسے مولوی عبدالحق نے اپنے خطبوں میں لکھا ہے۔ پیش کر کے حالی کے انقلاب ذہن کی نشان دہی کرتے ہیں:

ڈاکٹر محمد اقبال ایک زمانے میں انارکلی میں رہتے تھے، اس بازار میں رہنے کے مکان اوپر تھے اور نیچے دُکانیں تھیں جہاں ڈاکٹر محمد اقبال رہتے تھے، اس کے عین نیچے ایک درزی کی دُکان تھی، جس نے نہایت جلی حروف میں خوش خط شیشے کے ایک چوکھٹے میں غالب کا یہ مصرع لکھ رکھا تھا:

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اقبال نے کہا اس درزی کی فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے، وہ قوت کے تقاضا کو کیا خوب سمجھا اور اس نے اس مصرع سے کیا خوب کام لیا، اس نے ہماری بھی ایک مشکل حل کر دی یعنی انسان اب درزی کی دکانوں، ہیر کٹنگ سیلون اور بیوٹی کلچر ایوانوں میں بنتے ہیں۔ (۳۹)

حالی کی ایک چھوٹی بارہ شعر کی نظم موچی ہے۔ جہاں ایک بچہ جو کہتا ہے ''میں موچی کہلاتا ہوں'' اس میں بتایا گیا ہے کہ موچی کیسے چمڑے سے جوتا بناتا ہے، اس میں موچی کے اوزار اپنی اور برشا اور اس کام میں بھی محنت عمدگی کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ ہم کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں:

چمڑا مول منگاتا ہوں　　دھو کے اُسے سکھلاتا ہوں
مَل کر نرم بناتا ہوں　　کرتا ہوں خوب ان کو صفا
پھر لے پنا اور تلا　　سیتا ہوں دونوں کو ملا
پھر جوتی قالب پہ چڑھا　　ٹھوک ٹھکا اور کوٹ کٹا
راپنی سے برشا کے تلا　　سیتا ہوں دونوں کو ملا
سال کے اندر میرا بوٹ　　میں ضامن جو جائے ٹوٹ

اسی طرح سپاہی اور چٹھی رساں یعنی پوسٹ مین کے بارے میں قدرے تفصیل سے اُن کے کام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حالی کی ایک عمدہ بچوں کی نظم ہے ''روٹی کیوں کر میسر آتی ہے'' یہ نظم مثنوی کی شکل میں تقریباً اسی (۸۰) اشعار سے بنی ہے۔ یہاں حالی نے پہلے تو بچوں کو یہ بتایا ہے کہ کسان گیہوں اگاتا ہے اور اسے بازار میں فروخت

کرتا ہے جیسے خرید کر گھر میں ماں چکی سے پیس کر آٹا بناتی ہے اور چھان کر اس کو گوندھ کر روٹی پکاتی ہے۔ لیکن ان سادے کام کاج بیان کرتے ہوئے حالی بچوں کے لیے نصیحت کے علاوہ مزاح کے پہلو بھی نکالتے ہیں:

کسانوں کا ہے یہ احسان ہم پر　　کہ ہوتے ہیں گیہوں ہم کو میسر
خدا کے گھر کا سمجھو ان کو مودی
وہ بے چاری ہمیشہ صبح ہوتے　　کہ جب تم بے خبر ہوتے ہو سوتے
جھٹ آٹا پیسنے جا بیٹھتی ہے
اسی چکی کا پیسا تھا وہ آٹا　　چڑھے پروان ہو تم جس کو کھا کھا
لگی جب گوندھنے آٹا جھپا جھپ　　اور اس میں مارنے کی شپاشپ
وہ یوں آنے کو ہے دیتی ٹھکیتی　　کہ گویا لڑ رہی ہے اس سے کشتی

حالی نے روٹی جو گھر پر توے پر پکائی جاتی ہے اور باہر تندور پر بنائی جاتی ہے دونوں کو خوبصورت طریقے سے بیانیہ شعروں میں نظم کیا ہے۔ کچھ الفاظ جیسے روٹی کو جس کپڑے کے گدھے پر لگا کر تنور میں لگاتے ہیں بچوں کو سکھاتے ہیں۔

گھڑی ہاتھوں میں پھیلائی بڑھائی　　رفیدے پر دھری اور چٹ لگائی

اس نظم کا خاص حسن اس میں ماں کی محنت اور اس کی بچوں کی خاطر ہر قسم کی زحمت کو برداشت کرنا ہے جس سے بچوں کے دل و دماغ میں ماں کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا ہوا:

بھلا ماں کے سوا کس سے بن آئے　　نہ کھائے آپ اور سب کو کھلائے
یہی رہتا ہے دن رات اس کو رونا　　پکانا ریندھنا سینا پرونا
اُسے تم کو کھلانے سے ہے مطلب　　نہیں کچھ اپنے کھانے سے ہے مطلب
وہ کرتی رہتی ہے تم سب کی خدمت　　نہیں ملتی اُسے مرنے تک فرصت
نہیں کر سکتے حق ان کا ادا تم　　کرو ان پر سے گر جاں بھی فدا تم
سمجھ لو اس سے ماں کی قدر و عظمت　　کہ اس کے پاؤں کے نیچے ہے جنت

ایک نو شعری کی مثنوی **دھان بونا** میں دھان کس طرح بویا جاتا ہے جس میں کئی ہندی الفاظ سیوا، سہاگا، گیانی اور محاورے دھان پان استعمال کیا گیا ہے:

بس دھان کو نازک ایسا ہی جان　　ہو جیسے کہ دھان پان انسان

حالی کو بچوں کی نظموں میں سب سے نسبتاً مشکل نظم گھڑیاں اور گھنٹے کے عنوان سے مسدس کی شکل میں چوبیس اشعار کی نظم ہے جس کا محور وقت ہے یعنی گھڑیاں جو وقت بتانے کا آلہ ہیں وہ دن رات کام کرتی رہتی ہیں۔ انھیں دن رات گرما سرما اوپر نیچے امیر غریب بلندی پستی شاہ و گدا سب کے پاس ایک ہی حالت میں مسلسل چلتی رہتی ہے تھکن اور آرام ان کے لیے موت ہے چناں چہ انسان کو بھی رکنا نہیں چاہیے بلکہ زندگی کا سفر ہر طرح اور ہر

طریقے سے جاری وساری رہے۔ سچ کہا ہے؟ حرکت میں برکت ہے، کچھ شعر نمونے کے پیش کر رہے ہیں۔

دوپہر ہو یا رات ہو یا صبح ہو یا شام — جب دیکھیے چلنے سے سدا اپنے انھیں کام
مینا کے اوپر ہوں کہ تہہ خانے کے اندر — رکھے انھیں پاس اپنے سکندر کہ قلندر
ان کو نہیں یاں اونچ کا یا نیچ کا کچھ غم — اپنی اسی ٹک ٹک سے سروکار ہے ہر دم
دیتے ہیں سنو غور سے ہر دم یہ دہائی — لو وقت چلا ہاتھ سے کچھ کر لو کمائی

حالی نے مسدس کی شکل میں ٹیپ کے شعر کو ساتوں بندوں میں یکساں رکھ کر ترجیع بند لکھا:

قوم کو اچھے کام دکھاؤ — نیک بنو نیکی پھیلاؤ

سچ بولو، صاف اور ستھرائی رکھو، ہمسائے سے اچھا برتاؤ کرو، محنت کرو علم حاصل کرنے کے لیے کمانے کے لیے اور رحم دل رہو۔ بری عادتوں میں مت پڑو:

سچ بولو سچے کہلاؤ — سچ کی سب کو ریس دلاؤ
ہو گی تم میں گر ستھرائی — سب سیکھیں گے تم سے صفائی
جو پڑھنے میں کرتے ہیں محنت — سیکھتی ہے شوق اُن سے جماعت
نیک ہے نیکی سب کو بتانا — بد اوروں کو بد ہے بناتا

جواہرات حالی میں ایک مثنوی انچاس شعر کی ایک چھوٹی بچی کے خصائل کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ نظم حالی نے ۱۹۰۹ء میں ممتاز فاطمہ عرف سیدہ خاتون کے لیے لکھی جب وہ ڈھائی سال کی تھی۔ سیدہ خواجہ غلام ثقلین کی بیٹی اور غلام سیدین کی چھوٹی بہن تھی۔ حالی اسے بہت چاہتے تھے۔ حالی نے اس نظم میں نہ صرف سیدہ کی رفتار و گفتار صورت وشکل و عادت ومزاج کو اس نظم میں پیش کیا ہے بلکہ اُس کی نفسیات اور بچوں کے نکات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس نظم کو ہر دوڈھائی سالہ بچے کی نفسیات عادات اور خصوصیات سے جوڑا جا سکتا ہے:

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے — صورت اچھی سمجھ میں اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان — پر سب اچھے بُرے کی ہے پہچان
ہے ادب سے بڑوں کا لیتی نام — سب کو کرتی ہے ہاتھ اٹھا کے سلام
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول — بولتی ہے سدا ادھورے بول
نئے آتے ہیں گھر میں جب مہمان — دیکھتی ہے مڑ مڑ سب کو
پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو
بس جہاں بھائی کے پاس آیا — اور وہیں اُس نے ہاتھ پھیلایا
عمر اس کی خدا دراز کرے — علم سے اس کو سرفراز کرے (۴۰)

حالی لڑکیوں کی تعلیم کے حامی تھے۔ وہ دعا کے ساتھ اس کا بندوبست بھی کرتے تھے چناں چہ اپنے خاندان اور محلے کی لڑکیوں کے لیے لڑکیوں کا مدرسہ کھولا تھا۔ حالی کے تمام تر کلام کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کی

شاعری کا ایک اہم مقصد بچوں اور نئی نسل کے نوجوانوں میں تعلیم و تربیت کا شوق محنت اور کوشش کی عادت، شرافت اور انسانیت کی نمو اخلاق و کردار سازی کے ساتھ ساتھ وقت کی قدر ہمت و استقلال کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ وہ جانتے تھے بزرگوں پر اخلاقی فرض ہے کہ وہ بچوں کی رہنمائی کریں اور اکثر لوگ غفلت برتتے تھے۔ چناں چہ خود انھوں نے سیدھی سادی زبان میں میٹھے میٹھے انداز میں ان قدروں کو اپنی نظموں میں ایسا پیش کیا جو فوری دل نشین ہو گئے۔ قطعات ہو کہ رباعیات، غزلیات ہو کہ مثنویات مسدس ہو کہ ترکیب بند ہر صنف شاعری میں موقع کی نزاکت اور متن کی رعایت سے مذہبی، قومی، علمی، وطنی، اخلاقی، تعلیمی اور رفاہی نکات لکھ دیتے جو ان کے کلام میں مختلف طولانی نظموں اور چند قطعات کے علاوہ غزلوں کے اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں۔ خدا پر ایمان اور پیغمبر اسلام سے محبت جیسے خود رکھتے اُسی طرح نسل جوان کو بھی نصیحت کرتے۔

حالی قصے کہانی کے ذریعہ بچوں اور نوجوانوں میں نیکی ہمدردی اور مدد کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ کہیں یہ بتاتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا چراغ جو راستے پر بڑھیا نے رکھا ہے۔ وہ محلوں کے اُن فانوسوں اور برقی جھاڑوں سے بہتر ہے کیوں کہ یہ مٹی کا چراغ کئی لوگوں کا مونس اور مددگار ہے۔ دراصل یہی وہ چراغ ہیں جن کی معنوی روشنی افلاک تک پھیلی ہوئی ہے:

چھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں راہ سے آسان گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور فانوس سے روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا

حالی نے اسی طرح ایک دولت مند باپ اور اس کے تین بیٹوں کی کہانی نظم کی جس میں بتایا کہ خیانت نہ کرنا کسی معصوم زندگی کو بچانا نیک اور عمدہ کام ہیں۔ لیکن سب سے اہم اور مبارک کام دشمن سے انتقام کے بدلے رحم کرنا ہے۔ جیسا کہ اُس کے چھوٹے بیٹے نے دشمن کو بچا کر اپنی صورت بھی نہ بتائی یہ سب سے بڑا احسان تھا:

مارنا اس کا نہ تھا کچھ دشوار اک اشارہ میں تھا وہ لقمۂ غار
منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا اس کو شرمندۂ احسان نہ کیا

حالی خود محبّ وطن تھے اور اس جذبہ کو عام کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ان کی خوب صورت نظم حب وطن ان کے ایمان کا جز معلوم ہوتی ہے۔ حالی نے اس محبت کو صرف زبانی نہیں رکھا بلکہ اہل وطن کے ساتھ محبت اخوت ہم کاری، ہمدردی، خوش اخلاقی، ایثار و قربانی کا جذبہ بھی ضروری بتایا۔ حالی وطن کو خوش حال توانا اور پریم کا ساگر دیکھنا چاہتے تھے۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو قوم سے جان تک عزیز نہ ہو

حالی ایسے وطن کی ایک مشت خاک کو بہشت سے بدلنے کو تیار نہ تھے:

لوں نہ ہرگز اگر بہشت تری اک مشت خاک کے بدلے

حالی چوں کہ خود مذہبی ذہن کے مالک تھے اس لیے وہ نئی نسل میں خدا کی شان اس کی نعمتوں کا ذکر اس کی عبادت کا مزا اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق بندے پر زور دیتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایمان کا بیج بچپن ہی سے بویا جائے اس لیے نرم اور سلیس زبان میں معرفت کے درس دیتے تھے:

تو ہی ہے سب کا پالنے والا کام سب کے نکالنے والا
بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے

وہ خدا پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتے اور اسی پر ایمان کو کامیابی کی کنجی سمجھتے تھے:

خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے
پڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو سدا اپنی گاڑی کو تم آپ ہانکو

حالی نے اپنے کلام میں جا بجا عشق رسول ﷺ کو ظاہر کیا ہے۔ وہ سیرت رسول ﷺ کو شریعت کا لازم جانتے تھے۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات، اخلاقیات، حقوق انسان کی حفاظت، حریت اور حضور نبی کریم ﷺ کی اور ان کی اولاد پاکؓ کی محبت کو جزو دین مانتے تھے اور یہ محبت کا بیج وہ بچپن سے ہی دل میں بونا چاہتے تھے تا کہ وہ آگے چل کر عشقِ محمدی ﷺ کا توانا درخت بن جائے:

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے

حالی نے ضمیمہ مسدس کے ساتھ ایک نعتیہ نظم عرضِ حال بجناب سرور کائنات ﷺ لکھی:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دُعا ہے امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت اسی قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

ایک دوسری نعتیہ نظم دیکھیے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا بداندیشوں کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کا حِرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

اقبال حالی کی شخصیت اور تعمیری فکر کے عاشق تھے:

علامہ محمد اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور جس کا قیام ۱۸۸۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ اُس کے ۱۹۰۴ء کے اجلاس میں اپنی نظم **تصور درد** پڑھی۔ اس موقع پر دیگر شخصیات کے علاوہ حالی، ارشد گورگانی، محمد شفیع، سر عبدالقادر، سر فضل حسین، ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی موجود تھے۔ نظم ترنم سے پڑھی گئی۔ ایک شعر سے متاثر ہو کر حالی نے بے اختیار دس روپے کا نوٹ پیش کیا جو انجمن کے چندہ میں جمع ہوا۔ نظم کے اختتام پر خواجہ حسن نظامی نے اپنا عمامہ اُتار کر اقبال کے سر پر رکھ دیا۔ اس اجلاس کے دوسرے روز کی نشست میں حالی اپنی نظم پڑھنے کے لیے اٹھے لیکن پیرانہ سالی کے سبب ان کی نحیف آواز حاضرین تک پہنچ نہ سکی۔ تبرک کے طور پر حالی نے کچھ پڑھا اور تھوڑی دیر بعد علامہ محمد اقبال اسٹیج پر آئے اور حالی کی نظم ''مادر پنجاب انجمن'' مٹانے سے پہلے یہ فی البدیہہ رباعی سنائی:

مشہور زمانے میں ہے نام حالی — معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا — نازل ہے میرے لب پہ کلامِ حالی (۴۱)

☆ سر عبدالقادر خدنگ نظر لکھنؤ میں ۱۹۰۲ء میں لکھتے ہیں:

> مولانا شبلی ہی نے اقبال کے متعلق کہا تھا جب محمد حسین آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔ (۴۲)

☆ جسٹس جاوید اقبال زندہ رود میں لکھتے ہیں:

> **جاوید منزل** میں علی بخش کے علاوہ رحماں اور دیوان علی بھی گھر کا کام کاج کرتے تھے۔ دیوان علی اچھا خاصا گا لیتا تھا۔ کبھی کبھار اقبال کو ہارمونیم پر خواجہ غلام فریدؒ، سلطان باہوؒ، بلھے شاہؒ اور دیگر شعرا کا کلام سنایا کرتا۔ بعض اوقات راجہ حسن اختر اپنے ساتھ سجاد سرور نیازی کو لاتے اور وہ اقبال کو غالب، حالی یا ان کا کلام ہارمونیم کے ساتھ گا کر سناتے۔ (۴۳)

ایک مرتبہ اقبال نے جاوید کو مسدس حالی پڑھنے کے لیے کہا اور خاص طور پر وہ بند ... جسے میاں محمد شفیع نے دہرایا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو سنتے ہی اقبال آبدیدہ ہو گئے۔

علامہ محمد اقبال حالی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بی افسرد — سید دیگری او را نمی از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہای جگر سوز نیا سود — تا لالہ شبنم زدہ را داغ جگر داد

> یعنی وہ صحرا میں اگنے والا لالہ جو افسردگی اور خزاں کا شکار تھا۔ سر سید نے اس کو اپنے آنسوؤں سے سینچا حالی اپنے درد بھرے نغموں سے اس وقت تک خاموش نہ ہوا جب تک کہ لالہ بے

حرارت کو داغ جگر دے دے۔

اقبال نے حالی کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر حالی کو خراج عقیدت ان چار شعروں میں پیش کیا:

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی نیک می بینم چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

عرفی شیرازی کی طرح اونٹ کے مزاج کو خوب جانتا ہوں اور جب محمل کو سنگین دیکھتا ہوں تو حدی نغمے کو بلند آواز پڑھتا ہوں۔

حمیداللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو ز الطاف تو موج لالہ خزد از خیابانم

حمید اللہ خان کی وجہ سے ملک اور ملت کو بلندی نصیب ہوئی ان کے لطف و کرم سے میری راہ میں گل اور لالہ کی نشو و نما ہو رہی ہے۔

طوافِ مرقد حالی سزد ارباب معنی را نوائے او بجانها فگند شوری کہ می دانم

حالی کی قبر کا طواف اہل فہم کو جچتا ہے کیوں کہ ان کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیتی ہے جس میں سے میں واقف ہوں۔

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم

آ کے فقر اور شاہی کو حالی کے حضور میں مل کر پیش کریں، تو ان کی قبر جو جواہر نچھاور کر اور میں پھولوں کے بکھیر دوں۔ (۴۴)

بھوپال کے نواب حمید اللہ خان نے اس سالگرہ کے جشن میں حالی کو سراہتے ہوئے ان کے فیض کے تاثرات میں علامہ محمد اقبال کے مقام و کلام کے وجود کا اعتراف کیا۔ اقبال نے بانگِ درا کی نظم **شبلی و حالی** میں لکھا:

خاموش ہو گئے چمنستاں کے راز دار سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی وک رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستان حالی بھی ہو گیا سوے فردوس رہ نورد (۴۵)

حالی کے خواب جو پورے نہ ہو سکے!!

ایک کامیاب شخص آرزوؤں اور جستجوؤں کا پتلا ہے۔ غالب نے کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے بہت نکلے مرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے

حالی نے اپنی (۷۷) سالہ زندگی میں بہت سے مثبت کام کیے اور بہت سے کام گردش دوراں سے نہ ہو سکے۔ اس تحریر میں ہم ان خوابوں کو جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے بیان کریں گے:

☆ حالی چاہتے تھے دہلی میں ایک بڑا مطبع جاری کریں جس میں عمدہ مصنفوں کی کتابوں کو شایع کیا جائے، قدما کی عربی اور فارسی تصنیفات جو شائع نہیں ہوئیں نہایت حسن اہتمام کے ساتھ چھپوایا جائے اور ایک ماہانہ رسالہ بھی اجرا کریں جس میں ہندوستانیوں کو یورپ کی ترقیات کی طرف مائل کریں۔ یہ آرزو پوری نہ ہو سکی

کیوں کہ اس عمدہ کام کے لیے سرمایے کی ضرورت تھی جو حالی کے پاس نہ تھا۔

☆ اردو زبان کی تذکیر و تانیث کے اصول مرتب کر کے ایک کتاب لکھنے کا خیال پورا نہ ہو سکا۔

☆ عمدہ ناول اور شاہکار ڈرامے جو دوسری زبانوں میں ہیں، ان کو اُردو میں ترجمہ کرنا اور کروانا چاہتے تھے۔(۴۶)

☆ مولانا حالی نے ایک اال نامہ لکھنا شروع کیا تھا جو مزاح کا ایک عجیب و غریب اور دلچسپ نمونہ تھا۔ اس میں ہر مذہب اور فرقے کے تعصب، تنگ نظری، حماقت، جہالت، خودغرضی وغیرہ پر چوٹ کی گئی ہے۔ مکتوباتِ حالی میں ہمیں اس کے چند لفظ ملے ہیں جو یہاں درج کیے جاتے ہیں:

لفظ	معنی
المذہب	اعلانِ جنگ
الدین	تقلید آباؤ اجداد
العلم	قسمے از جہل مرکب
الامتحان	آزمایشِ لیاقتِ ممتحنان
الیونیورسٹی	کارخانہ کلرک سازی
المسلمانانِ ہند	چوں مار گزیدہ از ریسماں ترسندگان
الرئیس	آں کہ از ریاست بے خبر باشد
الامیر	آں کہ تہیدست و قرضدار باشد
المولوی	آں کہ مسلماناں را از دائرہ اسلام خارج می کردہ باشد
الواعظ	آں کہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند
الشکار	بہانۂ آدم کشی

افسوس ہے کہ مکمل نہ ہو سکا ورنہ اپنے طرز کی لاجواب طنزیہ چیز ہوتا۔'' (۴۷)

☆ حالی عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ دیتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے پانی پت میں اپنے خاندان اور ہمسائے کی لڑکیوں کے لیے ایک مکتب کھولا لیکن بہت جلد استادنی کے نہ ہونے کی وجہ یہ مکتب بند ہو گیا۔

☆ حالی باقاعدہ طور پر ایک ہائی اسکول کھولنا چاہتے تھے۔ چناں چہ ۱۹۰۱ء میں جب ملکہ وکٹوریا کا انتقال ہوا تو ان کی یاد بود میں ایک ادارہ قائم کیا گیا جس میں حالی نے ایک اسکول قائم کرنے کی تجویز کو منظور کروا کر چندہ جمع کرنے کا کام شروع کیا لیکن بدقسمتی سے تین ہزار روپے جمع کر سکے۔ چناں چہ یہ رقم ایک ہائی اسکول کے لیے بہت کم تھی اس لیے اس رقم سے حالی نے ملکہ وکٹوریا لائبریری قائم کی جو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ختم ہو گئی۔ حالی اسکول کا خواب حالی کے چھوٹے

بیٹے سجاد حسین نے پورا کی اور حالی اسکول قائم ہوا اور اس اسکول نے ترقی بھی کی لیکن افسوس کہ یہ اسکول بھی ۱۹۴۷ء کے بلوے میں ختم ہو گیا۔

☆ حالی کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلا درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ خود کوئی ڈراما لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے مجبور تھے۔

حواشی:

(۱) افتخار احمد صدیقی۔ **کلیات نظم حالی**، جلد دوم۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ص ۳۴۱

(۲) حالی۔ **یادگارِ غالب**۔ شانتی پریس الٰہ آباد۔ ص ۱۱۳

(۳) رخسانہ مراد۔ **اُردو میں شخصی مرثیوں کا تنقیدی جائزہ**۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دلّی۔ ص ۹۵

(۴) رخسانہ مراد۔ **اردو میں شخصی مرثیوں کا تنقیدی جائزہ**۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دلّی۔ ص ۹۸

(۵) افتخار احمد صدیقی۔ **کلیاتِ نظم حالی**۔ جلد اوّل۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ص ۸

(۶) ایضاً ۔ ص ۳۲۷

(۷) سید تقی عابدی۔ **کلیاتِ غالب فارسی**۔ جلد اوّل۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، دلّی۔ ص ۳۱

(۸) ایضاً ۔ ص ۳۹

(۹) ایضاً ۔ ص ۴۰

(۱۰) خواجہ غلام الثقلین۔ **تذکرہ حالی**۔ ص ۱۴۲

(۱۱) افتخار احمد صدیقی۔ **کلیاتِ نظم حالی**۔ ص ۸

(۱۲) مالک رام۔ **حالی**۔ ساہتیہ اکادمی دلّی۔ ص ۲۸

(۱۳) افتخار احمد صدیقی۔ **کلیاتِ نظم حالی**۔ ص ۳۵۳

(۱۴) غالب انسٹی ٹیوٹ دلی۔ **الطاف حسین حالی تحقیقی و تنقیدی جائزے**۔ ص ۴۴۴

(۱۵) ایضاً ۔ ص ۳۷

(۱۶) مالک رام۔ **حالی**۔ ص ۸۵

(۱۷) صالحہ عابد حسین۔ **یادگارِ حالی**۔ انجمن ترقی اردو دہلی۔ ص ۱۸

(۱۸) عبدالحق۔ **چند ہم عصر**۔ اردو اکادمی سندھ کراچی۔ ص ۱۷۸

(۱۹) ایضاً ۔ ص ۱۷۷

(۲۰) غالب انسٹی ٹیوٹ دلی۔ **الطاف حسین حالی تحقیقی و تنقیدی جائزے**۔ ص ۲۰

(۲۱) کلیم الدین احمد۔ **اردو تنقید پر ایک نظر**۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ ص ۸۷

(۲۲) ایضاً ۔ ص ۸۸

(۲۳) ایضاً ۔ ص ۱۰۴

(۲۴) ایضاً ۔ ص۱۱۰
(۲۵) وارث علوی۔ **حالی مقدمہ اور ہم**۔اردو رائٹرس گلڈ۔الہٰ آباد۔ص۵۳
(۲۶) کلیم الدین احمد۔ **اردو تنقید پر ایک نظر**۔ص۹۳
(۲۷) وارث علوی۔ **حالی مقدمہ اور ہم**۔ص ۲۷
(۲۸) ایضاً ۔ ص ۸۸
(۲۹) افتخار احمد صدیقی۔ **کلیات نظم حالی**۔جلد دوّم۔ص ۳۹۷
(۳۰) صالحہ عابد حسین۔ **یادگارِ حالی**۔ص ۲۱۷
(۳۱) سرسید احمد خان۔ **تہذیب الاخلاق**۔ص علی گڑھ
(۳۲) مسعود حسن ادب۔ **ہماری شاعری**۔کتاب نگر لکھنؤ۔ص ۲۶
(۳۳) صالحہ عابد حسین۔ **یادگارِ حالی**۔ص ۲۱۶
(۳۴) حالی۔ **حیاتِ جاوید**۔ترقی اردو بیورو۔دلّی۔ص ۲۶
(۳۵) صالحہ عابد حسین۔ **یادگارِ حالی**۔ص ۲۱۷
(۳۶) ایضاً ۔ ص ۲۱۸
(۳۷) مجتبیٰ حسین۔ **ادب و آگہی**۔مکتبہ افکار۔ص ۱۳۹
(۳۸) افتخار احمد صدیقی۔ **کلیاتِ نظم حالی**۔جلد اوّل۔ص ۲۰
(۳۹) عبدالحق۔ **چند ہم عصر**۔اردو اکادمی سندھ کراچی۔ص ۱۳۲
(۴۰) افتخار احمد صدیقی۔ **جواہر حالی**۔لاہور۔ص ۳۰۸
(۴۱) جاوید اقبال۔ **زندہ رود**۔سنگ میل لاہور۔ص ۱۲۴
(۴۲) عبدالقادر۔ **مخزن**۔لاہور۔۱۹۰۲ء
(۴۳) جاوید اقبال۔ **زندہ رود**۔ص ۶۷۳
(۴۴) دیا نگم۔ **زمانہ**۔نومبر ۱۹۳۵ء
(۴۵) اقبال۔ **بانگِ درا**۔سنگ میل، لاہور۔ص ۲۲۲
(۴۶) عبدالحق۔ **چند ہم عصر**۔اردو اکادمی سندھ کراچی۔ص ۱۸۲
(۴۷) صالحہ عابد حسین۔ **یادگارِ حالی**۔ص ۵۵